دہلی کے اسکولوں میں
اردو نصاب کے مسائل

(سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)

مرتّبہ

صدیق الرحمٰن قدوائی

اردو اکادمی، دہلی

دہلی کے اسکولوں میں
اردو نصاب کے مسائل

دہلی کے اسکولوں میں
اردو نصاب کے مسائل

سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ

مرتبہ
صدیق الرحمٰن قدوائی

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعاتِ اردو اکادمی / ۱۵

تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے ارکان

ڈاکٹر خلیق انجم (چیئرمین)

حکیم عبدالحمید

خواجہ حسن ثانی نظامی

بیگم ریحانہ فاروقی

سید شریف الحسن نقوی (سکریٹری)

سنہ اشاعت : فروری ۱۹۸۷ء

قیمت : -/۲۳ روپے

بہ اہتمام : محمد عارفین (ڈپٹی سکریٹری)

معاون : ڈاکٹر انتظار مرزا

طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، دہلی

ناشر : اردو اکادمی، دہلی

فہرست

ب:

ج:

حرفِ آغاز

دہلی ہندوستان کا دل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شہر اپنی تہذیبی روح، ثقافتی رنگا رنگی اور تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔ دہلی کلچر کے فروغ میں اردو نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اور آج بھی یہ زبان اس کی ادبی و تہذیبی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اردو کی کلچرل اہمیت اور دہلی کی ثقافتی زندگی سے اس کے گہرے رشتے کے بیشِ نظر آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی، سابق وزیرِ اعظم مرکزی حکومتِ ہند کے ایما پر ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔

اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور طے شدہ دستور العمل ہے۔ دہلی کے لفٹننٹ گورنر اس کے صدر نشین (چیئرمین) ہیں اور اکادمی کے اراکین کو دو سال کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ ان اراکین میں ممتاز اہلِ قلم، ادیب، نقّاد، صحافی، معلّم اور محقق شامل ہیں۔ اکادمی دہلی اور بیرونِ دہلی کے دوسرے علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی حلقوں سے بھی رابطہ قائم کیے ہوئے ہے اور اپنی سرگرمیوں میں اُن کے تعاون اور مشوروں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہے اور کتاب کا مطالعہ اس کا شریف ترین مشغلہ، کتاب ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے جوڑنے کا سب سے عمدہ وسیلہ ہے۔ اپنے اس بیش بہا ورثے کو محفوظ کرنا اُسے خوب تر اور مفید تر بنانا ہمارے تہذیبی فرائض کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ یہ گویا ادبی روشنیوں کو عام کرنا اور علمی خوشبوؤں کو پھیلانا ہے۔

اکادمی نے نہایت اہم موضوعات پر اچھی کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے اُسی کے

تحت مذاکرے، سیمینار/ورکشاپ منعقد کیے اور ان میں پیش کیے جانے والے مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ "دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل" اسی سلسلہ پیش کش کا ایک حصہ ہے۔ یہ دو روزہ سیمینار غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ۲۷، ۲۸ نومبر ۸۵ء کو منعقد ہوا۔ اس کے لیے ہم اس کے فاضل مرتب کی علمی کاوشوں کے ممنون ہیں۔ اور اس تعاون کے بھی جو اشاعتی کمیٹی کے ارکان کی طرف سے ہمیں میسر آتا ہے اور ہمارے لیے روشنی و رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تاریخ و ادبیات سے متعلق کچھ ایسی اہم کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھیں ایسی مزید کچھ کتابیں ترتیب و اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔

ہم اپنے موجودہ سرپرست اور اکادمی کے صدر نشین ایر وائس مارشل (ریٹائرڈ) جناب ایچ۔ ایل کپور صاحب کی عنایات اور توجہات کے بے حد ممنون ہیں۔ ایگزیکٹیو کونسلر (تعلیم) جناب کلانند بھارتیہ کی عنایت کا بھی اعتراف ہے اور ان کی رہنمائی کے لیے بھی شکر گزار ہیں۔

فروری ۱۹۸۷ء

سید شریف الحسن نقوی
سکریٹری
اردو اکادمی، دہلی

پیش لفظ

اردو کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ اس کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے ہندوستان کے ہر صوبے میں خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس لیے تقریباً ہر صوبے میں ایسے اسکول موجود ہیں جن میں اردو کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے یا اردو بحیثیت مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ اردو کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ہندوستان کے تقریباً ہر صوبے سے اردو اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ لیکن اردو کی یہی طاقت اس کی بہت بڑی کمزوری بھی بن گئی ہے۔ اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش جیسے صوبوں میں ایسے ضلعوں کی تعداد خاصی ہے جن میں اردو بولنے والوں کی تعداد چالیس فی صدی سے زیادہ ہے۔ لیکن پورے صوبے میں اردو بولنے والوں کی تعداد گیارہ بارہ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اتر پردیش میں اردو والوں کی تعداد لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ ہے، لیکن یہ تعداد صوبے کی پوری آبادی کی گیارہ بارہ فی صدی ہے۔ اس لیے ڈیڑھ کروڑ لوگ زبان کے معاملے میں اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہیں۔ جمہوریت کے اعداد و شمار کی وجہ سے اردو کشمیر کے علاوہ کسی اور صوبے کی سرکاری زبان نہیں بن سکی۔ اور بعض وجوہ سے کشمیر کی صوبائی حکومت نے بھی آج تک اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ تمام صوبائی حکومتیں اپنی علاقائی اور سرکاری زبان کی ترقی میں اتنی مصروف ہیں کہ ان کے پاس اردو یا صوبے کی دوسری اقلیتی زبانوں کے مسائل پر غور کرنے کا وقت ہی نہیں ہے۔

کچھ عرصے پہلے تک اردو والے بے حسی اور مایوسی کا اس طرح شکار تھے کہ انھوں نے

اردو کے کسی مسئلے کے حل کے لیے خود کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ ۱۹۷۲ء میں گجرال کمیٹی قائم ہوئی۔اس کی سفارش پر مختلف صوبوں میں اردو اکیڈمیوں کے قیام سے اردو کے حق میں فضا سازگار ہوئی ہے۔ اب اردو والے مایوسی کی دنیا سے باہر نکل رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمام اکیڈمیاں ہماری توقع کے مطابق کام نہیں کر رہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ اکیڈمیاں اردو کو نئی زندگی دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ تقریباً تمام اکیڈمیاں اردو تعلیم کے مسائل کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ اردو اکادمی، دہلی نے بھی سب سے زیادہ توجہ اردو تعلیم کے مسائل ہی پر دی ہے۔ ہر سطح کے استادوں اور طالب علموں کو انعامات، وظیفے اور مالی مدد کے علاوہ طرح طرح کے تعلیمی مقابلے انہی کوششوں کا حصہ ہیں۔

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی سرپرستی کی وجہ سے ہندوستان کی تمام صوبائی زبانوں میں تعلیم کے نصابی مسائل کے سلسلے میں بہت کچھ کیا گیا ہے اور بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔ اردو میں اردو اکادمی دہلی نے ''دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل'' پر اعلیٰ پیمانے پر سیمینار منعقد کر کے اس سلسلے میں بہت اہم قدم اٹھایا ہے۔ یہ سیمینار ۱۹۸۵ء میں منعقد ہوا تھا اور کوشش کی گئی تھی کہ اس مسئلے کے تمام اہم پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ اکادمی اپنی کوشش میں کامیاب رہی ہے۔ میں صدیق الرحمٰن قدوائی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ان مقالوں کو ترتیب دینے میں جان کھپا کر بہت سلیقے سے انھیں کتابی صورت میں مرتب کیا ہے۔

خلیق انجم

فروری ۱۹۸۷ء

مقدمہ

دہلی اردو اکادمی نے اپنے قیام کے وقت سے ہی اسکولوں میں اردو تعلیم کے مسائل کو اپنے پروگراموں میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس سے قبل بھی اس طرح کے سیمنار منعقد ہو چکے ہیں اور یقیناً آئندہ بھی مسائل کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کی طرف توجہ دی جاتی رہے گی۔

اسکولوں کے اردو نصاب کی تالیف و اشاعت کئی اعتبار سے اہم ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اردو کی طرف عام رویے کی بنا پر جو وسائل اور آسانیاں عموماً دوسری زبانوں کو حاصل ہیں ان سے اردو کے اسکول محروم رہے ہیں۔ ان محدود وسائل کے بھی امکانات سے جتنا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا وہ نہیں اُٹھایا گیا اور اس میں خود ہم اردو والوں کا قصور زیادہ ہے۔

گذشتہ چالیس برس میں عالمی سطح سے لے کر ہمارے ملک کی علاقائی سطحوں تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا اظہار و انعکاس ہمارے نصابوں میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب وقتاً فوقتاً اردو تعلیم کی صورتِ حال کا جائزہ لیا جاتا اور حالات کے تقاضوں کے مطابق اس کی اصلاح کی کوشش کی جاتی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ شاید اس لیے کہ حکومتوں اور اردو کے مخالفوں کے رویے نے اگر ایک طرف اردو کے حقوق کے لیے جدوجہد کے دروازے کھول دیے تو دوسری طرف ہم پر مظلومیت کا احساس بھی طاری کر دیا اور ہم اپنے آپ پر ترس کھانے میں اتنا محو ہو گئے کہ جو کچھ تھوڑا بہت کر سکتے تھے وہ بھی نہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفوں کی ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساتھ ہماری بے توجہی نے بھی اردو کو نقصان پہنچایا۔ خصوصاً اسکولوں میں اردو تعلیم دوسرے

مضامین کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئی۔ چنانچہ آج جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریزی ادب اور ہندی ادب کے طالب علم بارھویں جماعت پاس کرنے کے بعد جو صلاحیتیں حاصل کر لیتے ہیں اردو کے اسی منزل سے گزرنے والے طلبہ عموماً وہاں تک نہیں پہنچتے۔ ہماری نصاب کی کتابیں ابھی تک پرانی ہیں مگر پہلے ان ہی کتابوں سے لوگ جو کچھ حاصل کر لیا کرتے تھے وہ بھی آج کے طلبہ نہیں کر پاتے۔ آج زبانی اور تحریری اظہار کی قوت اردو کے طلبہ میں پہلے کے مقابلے میں کم ہوتی جا رہی ہے جب کہ دوسری زبانوں کے طلبہ میں صلاحیتیں زیادہ ہیں۔ طلبہ کے لہجے، تلفظ، املا میں سال بہ سال غلطیاں پہلے کے مقابلے میں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کی معلومات اور واقفیت کی عام سطح بھی آج پہلے کے مقابلے میں کم ہے۔

ان سوالات کے متعدد حلوں میں سے ایک حل یہ بھی ہے کہ ہم اسکولوں میں اردو نصاب کی موجودہ صورت حال پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ آج کی ضرورتوں کے مطابق ہم اپنی درسی کتابوں کو کس طرح بہتر بنا سکتے ہیں۔ جن سے طلبہ میں اظہار کی صلاحیتیں بھی پیدا ہو سکیں اور جن میں ادب کے مطالعے کا رجحان ہو ان کے مذاق کی جِلا ہو سکے۔ اسکول کی سطح پر اردو پڑھنے والا ہر طالب علم محض ادیب یا شاعر نہیں ہو سکتا اور نہ سب کو ہونا چاہیے مگر زبان و ادب کی تعلیم کے ذریعے اظہار کی قوت کے ساتھ ساتھ اُس جمالیاتی حس کو بیدار کیا جانا چاہیے جو ہر شخص میں ہوتی ہے خواہ وہ پیشہ ور ادیب و شاعر نہ ہو سکے۔

آج جب کہ ایک نئی تعلیمی پالیسی کو عمل میں لانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور سارے ملک میں تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے لوگ مجوزہ پالیسی پر غور و غوض کر رہے ہیں تو لازم ہے کہ اردو کی ضرورتوں کے پیش نظر ہم بھی اس بحث و مباحثے میں شریک ہوں اور اپنے خیالات کو اربابِ حل و عقد تک پہنچائیں۔ اسکولوں کی سطح پر تعلیم کے مسائل کی اہمیت کا ذکر آج ہر جگہ ہوتا ہے۔ اردو کے حوالے سے بھی یہ بات ہم سب اکثر کہتے رہتے ہیں کہ اردو کے مستقبل کا دار و مدار اردو تعلیم کی بہتر تنظیم پر ہے۔ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے رویے کے خلاف احتجاج کرنا اور اپنے حقوق کے حاصل ہونے تک اس احتجاج کی لے کو تیز تر کرنا تو موجودہ صورتِ حال میں ہم سب پر لازم ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ گذشتہ برسوں کی طویل جد و جہد کے نتیجے میں

جو نئے امکانات اجاگر ہوئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور محدود پیمانے پر ہی سہی ہم اردو تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے جو کچھ بھی کر سکیں، کریں۔

دہلی اردو اکادمی کی طرف سے نصابات پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا تاکہ اس سے متعلق مسائل کا جائزہ لیا جائے اور اس جائزے کی بنیاد پر ایسی تجاویز مرتب کی جائیں جن سے نصاب کی تالیف و اشاعت میں آئندہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ کتاب ان مقالات پر مشتمل ہے جو اس سیمینار میں پڑھے گئے۔

اس سیمینار میں شرکت کے لیے اسکولوں کے اساتذہ اور نصاب کی ترتیب و تحقیق اور اشاعت کی سرگرمیوں میں مصروف رہنے والے اداروں کے نمائندوں کو بالخصوص دعوت دی گئی تھی اس دوروزہ سیمینار میں پرائمری، مڈل، سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری اسکولوں کے نصاب کے مختلف پہلوؤں پر معاونِ نصاب کتابوں کی ترتیب و تدوین کے بارے میں اور غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کے مسائل پر مقالات پڑھے گئے اور سیر حاصل بحث ہوئی۔

سیمینار کا افتتاح ملک کے ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ نے فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر کا بیش تر حصہ تعلیمی مسائل کی تحقیق و تدریس میں گزرا ہے۔ مدتوں جامعہ ملیہ کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل اور پھر ایجوکیشن فیکلٹی کے صدر رہے ہیں اور ہندوستان کے سب ہی تعلیمی اداروں سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں۔ آپ کی تصانیف نے اردو تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نئی راہیں روشن کی ہیں۔ ان کے علاوہ جناب پروفیسر باقر مہدی اور جناب خلیل الرب صاحب نے بھی سیمینار کے دوسرے اجلاس میں صدارت فرمائی اور اپنے وسیع تجربات پر مبنی بیش قیمت خیالات سے سیمینار کے شرکا کو مستفید فرمایا ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

سیمینار میں جن حضرات نے مقالے پیش کیے وہ سب جانے پہچانے حضرات ہیں انھوں نے درس و تدریس میں ایک عمر گزاری ہے نصاب کے مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے ہمیں امید ہے کہ ان کے افکار و تجاویز سے اردو دنیا استفادہ کرے گی۔

فروری ۱۹۸۷ء

صدیق الرحمٰن قدوائی

محمد ذاکر

اسکولوں کا اردو نصاب

تعلیم، کیا؟ اور کیوں؟ اور کیسے؟

انسان ہی وہ مخلوق ہے جس نے زبان جیسا ادارہ دریافت کر کے اسے قائم رکھا ہے اور اسی کے ذریعے وہ اپنی مادی ترقی اور ذہنی زندگی کی بقا اور تسلسل جاری رکھتا ہے محض جبلی طور پر وہ یہ نہیں جان سکتا کہ اُسے کیا ہونا چاہیے، کیا کرنا چاہیے۔ اُس کے لیے ہمیشہ تربیت اور درس و تدریس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلیم دراصل ایک ایسا لائحہ عمل ہے جو کوئی سماج وقتاً فوقتاً اپنی مادی زندگی کے تقاضوں کے مطابق اور اپنی امتیازی تہذیبی اقدار کے استحکام اور ترویج کے لیے وضع کرتا رہتا ہے۔ اقدار کی یہ ترسیل، علوم مروجہ و مفیدہ کے اکتساب کے لیے بلوغ کی طرف بڑھتے ہوئے ذہن کو تیار کرنا اس طرح کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو کرتا رہے، یہی تعلیم ہے۔ اسی لیے عمر کی مختلف منزلوں کا خیال رکھتے ہوئے مکتب، مدرسہ، پاٹھ شالہ اور اسکول کالج یونیورسٹیاں قائم کی جاتی ہیں، ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ ادارے کھولے جاتے ہیں تاکہ اگلی نسل پچھلی نسل کی صحیح معنی میں وارث بھی ہو اور اس کی بنیاد پر نت نئے تقاضوں کی روشنی میں اپنی زندگی کا نظام طے کرے۔ اسی لیے نصاب اور درسی کتابوں کی ضرورت ہے تاکہ کم سے کم وقت میں اور بہتر طریقے سے نسل بعد نسل یہ سلسلہ ترسیل و ابلاغ چلتا رہے۔ اسکولوں کی درسی کتابیں ہرگز اس لیے نہیں ہوتیں کہ وہ طالب علم کو کسی علم کا منتہی بنادیں۔ وہ تو صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ اسکول کی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے وہ زبان و بیان سمجھنے کی اتنی استعداد پیدا کر دیں کہ اگر طالب علم کسی علم خاص کی اپنے

طور پر تکمیل کرنا چاہے تو اُسے دقت نہ ہو۔ گویا اسکولوں کی درسی کتابیں وہ بنیادیں ہوتی ہیں جن پر عمارت تیار ہوگی اور آئندہ پیڑھی کے انجینئر، ڈاکٹر، سائنسداں، فلاسفر، ادیب اور مبصر اور سب سے زیادہ اپنے مسائل کو سمجھ کر اُن کا حل ڈھونڈنے والے بالغ نظر پیدا ہوں گے۔

دورِ حاضر میں علوم فشار کی حد تک پھیل گئے ہیں اور اُن کی موشگافیاں اور تفصیلات اتنی ہوتی جاتی ہیں کہ بسا اوقات ان کا احاطہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اسکول کی سطح پر ان کے لیے بنیاد کس طرح ڈالی جائے کس طرح ان علوم سے آشنائی کرائی جائے؟ یہ ایک اہم سوال بن جاتا ہے اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر علم کے لیے ایک مخصوص زبان و بیان یا کہیے اصطلاحات و تصورات ہیں لیکن اس کے مقابلے میں اسکول کے نوعمر طالب علم کی جس زبان و بیان تک پہنچ ہے اس میں بسا اوقات یہ سکت نہیں معلوم ہوتی کہ اس کی بنیاد پر علوم جدیدہ سے آشنا کرایا جا سکے۔ اس کا ایک سبب بلکہ بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علوم جدیدہ کی ترقی اور نئے نئے انکشافات اس زبان میں نہیں ہوتے جو طالب علم کی مادری زبان ہوتی ہے۔ اردو کا معاملہ یہ ہے کہ یہ اُس ہندوستانی پر مبنی ہے جو عام بول چال کی بولی کی حیثیت سے ہندوستان کے بڑے علاقے میں سمجھ لی جاتی ہے۔ بولی کی حیثیت سے اس کی تاریخ بہت پرانی ہے مگر بدقسمتی سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ ایسی رہی کہ اسے طویل عرصے تک وہ وزن و وقار نہ مل سکا کہ اسے باقاعدہ اکتساب کرنے کی کوشش کی جاتی اور اس طرح اسے علمی زبان بننے کا موقع ملتا اور سوچنے والے دماغ اسی میں اپنے معاشرے کا حل سوچتے اور اپنے اپنے شوق اور رجحان کے مطابق اپنے پسندیدہ علم میں تحقیق کرتے اور اس کے نتائج اسی زبان میں پیش کرتے۔ شعر و شاعری کی بات اور ہے، اس کا تعلق کاروبارِ شوق سے زیادہ ہے۔ معاملہ نثر نگاری کا ہے جس کے ذریعے کاروبارِ دنیا چلتا ہے۔ واقعی بدقسمتی یہ ہوئی کہ علوم مفیدہ و جدیدہ کا سارا سرمایہ ایک ایسی زبان میں سامنے آیا جو ہندوستانی سے ملتی جلتی یا ہندوستان کی کوئی زبان نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ زبان ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح علوم جدیدہ سے تہی دامن رہی۔ اس صدی کے آغاز میں دورِ آصفیہ میں حیدرآباد میں جب اس پر سنجیدگی سے توجہ ہوئی تو اس میں کچھ انتہا پسندی شامل ہو گئی جو کئی وجوہ سے ناگزیر تھی۔ ہندوستانی یا کہیے اردو کی اس محدود پیمانے پر نشوونما ہونے کی وجہ سے آج بھی جب علوم جدیدہ کے بارے میں اسکولوں کے لیے

درسی کتابوں کی تیاری کا سوال آتا ہے تو اصطلاحات ایک بڑا چیلنج بن کر سامنے آتی ہیں۔

اس کے علاوہ چونکہ مخصوص سیاسی وجوہ کی بنا پر اردو کو وہ جگہ نہ مل سکی جو اس کا حق تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج اسکولوں میں ان طلبہ کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے جو اگرچہ اردو معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں مگر اردو کو باوجود اپنی مادری زبان کہنے کے اردو بس واجبی ہی جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے صورت حال یہ ہے کہ بہت محنت سے تیار کردہ سماجی اور طبیعی علوم کی درسی کتابوں سے ایک طرف طالب علم بیزار نظر آتے ہیں اور دوسری طرف خود کتاب ترتیب دینے والوں کو تسکین قلب کم ہی ہوتی ہے۔ پھر چونکہ ان علوم کی کتابیں بیشتر ترجمہ ہو کر آتی ہیں اس لیے ان کی فراہمی میں دیر بھی ہو جاتی ہے اور طلبہ پریشان رہتے ہیں۔

علوم جدیدہ کے پھیلاؤ اور اردو کی مخصوص تقدیر کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ رسمی تعلیم کی ابتدائی منازل یعنی اسکولوں کی سطح پر ایسی کتابوں کی تیاری پر توجہ دی جائے جن میں علوم جدیدہ سے آشنائی تو ضرور ہو مگر انھیں الگ الگ اس طرح نہ پیش نہ کیا جائے کہ ان کا رشتہ زندگی سے کٹا ہوا معلوم ہو۔ میرے خیال میں ابتدائی منزلوں میں درسی کتابیں اس نوعیت کی ہوں کہ ان میں زیادہ سے زیادہ علوم سے آشنائی تو ہو مگر ہر مضمون یا علم کی علیحدہ درسی کتابیں لازمی نہ سمجھی جائیں بلکہ انھیں ایک ہی کتاب کی مختلف جلدوں یا حصوں میں ترتیب دے دیا جائے اور اس کتاب کو زبان کی کتاب کہا جائے۔ ایسی کتاب کا ذخیرۂ الفاظ طالب علم کی عمر کا خیال رکھتے ہوئے متعین کیا جائے اور ایسی کتاب یا کتابیں ذخیرہ الفاظ کی درجہ بندی پر تیار کی جائیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی نصابی کتابوں کی تیاری ایک شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک جماعت یا ٹیم کی ضرورت ہے۔ ایسی جماعت جس کا واحد مقصد اردو کو اس قابل بنانا ہو کہ یہ جدید علمی ذخائر کے استعمال کے لیے طالب علم کو تیار کر سکے۔ ایسی کتابوں کی ترتیب و تالیف میں سب سے زیادہ اسی بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ زبان ایسی ہو کہ طالب علم اُسے آسانی سے سمجھ سکے، بول چال سے اُس کی قربت ہو مگر نصب العین اس کی ذہنی نشو و نما اور اس میں خود اعتمادی اور اپنے علم کو روزمرہ زندگی سے منطبق کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہو نہ کہ محض طالب علم کی آئندہ تعلیم کے لیے بنیاد فراہم کرنا۔ اُن درسی کتابوں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا جن میں ایسے الفاظ زیادہ ہوں

یا جن میں انداز بیان ایسا ہو جسے استاد کو مزید سادہ کر کے سمجھانے کی ضرورت پڑے۔

یہ کام کچھ ایسا نہیں ہے کہ ناممکن ہو۔ اسمٰعیل میرٹھی کی اردو زبان ہی کی کتابوں کے سلسلے کو دیکھیے انیسویں صدی کے تقریباً جملہ علوم جن سے آشنا ہونا ضروری تھا اور وہ اقدار صالحہ جن سے ہندوستانی سماج ممتاز رہا ہے، اس سلسلے میں بحسن وخوبی موجود ہیں۔ آج علوم جدیدہ کے پھیلاؤ کے باوصف یہ کام کٹھن تو ہے مگر ناممکن ہرگز نہیں۔

حکومت ہند نے غیر رسمی تعلیم کی جو اسکیم بنائی ہے اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے زیر اہتمام جو کتابیں اس مقصد کے لیے تیار کی جا رہی ہیں ان کی بنیاد اسی خیال پر رکھی گئی ہے اور میرے خیال میں نو سے چودہ سال تک کے بچوں کے لیے زبان کی کتاب ہی کے ذریعے علوم مفیدہ سے آشنا کرانا ممکن ہو گیا ہے۔

یہ بات ممکن ہے چونکانے والی ہو چونکہ فی الحال رسمی تعلیم کی جو صورت ہے یہ اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ آج کل رسمی تعلیم میں تیسری جماعت ہی سے تقریباً ہر مضمون کے لیے علیحدہ علیحدہ درسی کتابیں ہیں۔ ان کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ذخیرۂ الفاظ کی درجہ بندی پر مبنی ہیں، اور اگر ہوں بھی تو ان مضامین یا علوم کی باتوں کو امتحان تک ذہن میں محفوظ کرا دینا کافی سمجھ لیا جاتا ہے چاہے طالب علم خود یہ کتاب پڑھ سکے یا نہ پڑھ سکے، اس کی زبان سمجھے یا نہ سمجھے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں زبان سیکھنے اور برتنے کا سلیقہ سکھانے پر زور دینا زیادہ ضروری ہے۔

ایسی مجوزہ کتابوں میں اہم کام مشقیں تیار کرنے اور انھیں باقاعدہ کرانے کا ہے۔ اردو نصاب کی کتابوں میں آٹھویں تک مشقیں ہوتی ہیں مگر کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مذکر مونث، جمع واحد کے سوالوں سے زیادہ عبارت کے سمجھنے اور لفظوں کا استعمال سکھانے پر توجہ ہو۔ نویں اور دسویں درجے کی کتابوں میں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ہم جدید سے قدیم کی طرف چلیں۔ ضرورت سے زیادہ ادب عالیہ کی نمائندگی اس منزل پر ضروری نہیں۔ نصابی کتابوں کا مقصد محض اصناف شعر و ادب یا اردو کے کلاسیکی ادب سے روشناس کرانے سے زیادہ یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کے سامنے زبان و بیان کے ایسے نمونے پیش کیے جائیں جن سے طالب علم کو نامعلوم طور پر یہ احساس ہوتا رہے کہ ان کی زبان محض شعر گوئی یا داستان نگاری کے لیے نہیں ہے بلکہ اس میں زندگی سے متعلق

تمام علوم کی تحصیل اور ان کے تصورات کو پیش کرنے کے امکانات ہی نہیں بلکہ واقعی سکت و صلاحیت ہے۔

کچھ زیادہ دنوں کی بات نہیں۔ ایک دوست ناقل تھے کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سماجی علوم میں سے ایک مضمون کے امتحانات کی کاپیاں جانچ رہے تھے۔ ایک جواب پر انھوں نے امتیازی نشانات یا نمبر دیے۔ انھوں نے دیکھا تو اس میں زبان و بیان کی اتنی غلطیاں تھیں کہ باید و شاید۔ انھوں نے پوچھا کہ جب اس امیدوار کو بات کہنے کا صحیح طریقہ ہی نہیں آتا، جب وہ صحیح اور پورے جملے ہی نہیں لکھ سکتا تو امتیازی نشانات یا نمبر دینا کیسے جائز ہے۔ کہنے لگے "بھئی زبان و بیان کا معاملہ تم جانو مجھے تو اس کی معلومات سے مطلب ہے۔" ظاہر ہے وہ امیدوار خواہ کتنے ہی امتیازی نشانات حاصل کر کے کامیاب ہو گیا ہو مگر اس سے یہ توقع ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ مضمون متعلقہ سے کام لے کر صاف دماغی کے ساتھ سماج کا کوئی لائق تقلید فرد بن سکے گا۔ نصابی کتابوں میں چاہے وہ کسی بھی علم سے متعلق ہوں، زبان سیکھنے سکھانے پر توجہ دینا ازبس ضروری ہے۔

رسمی تعلیم میں اردو بھی مثل ایک مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔ اس کی کتابیں علیحدہ ہی ہوتی ہیں۔ ہمہ جہتی انداز نظر نہ ہونے کی وجہ سے ان کتابوں میں بالعموم وقت سے پہلے ہی شعر و ادب کے ایسے نمونے شامل کر لیے جاتے ہیں جن کی تعلیم کی اس منزل پر ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ آٹھویں درجے تک آتے آتے طالب علم اس لائق ہو جائے کہ اپنی زبان یعنی اردو میں تحصیل شدہ لیاقت کے ذریعے وہ نویں جماعت میں اپنے اختیاری مضامین میں اردو کو اپنا ذریعۂ تعلیم قرار دینے میں نہ ہچکچائے۔ ایک طرف زبان میں خاطر خواہ لیاقت یا استعداد کی کمی، دوسری طرف سماجی علوم کی ترجمہ شدہ خصوصًا ایسی کتابیں جن میں نئی نئی اصطلاحات بھی ہوتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے والے اکثر شاکی رہتے ہیں۔ اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھنے والے کچھ اس طرح شعر و ادب کے نمونوں پر پالے جا رہے ہیں جیسے اردو محض شعر و ادب کی زبان ہے۔

میرے خیال میں نویں اور دسویں اور گیارہویں درجوں میں بھی اردو زبان کی کتابوں کو

محض ادبی وشعری نمونوں تک محدود رکھنا نامناسب ہے۔ ہماری اردو زبان کی کتابیں ایسی ہونی چاہئیں جن کو پڑھ کر یہ احساس ہو کہ اردو ایک زندہ زبان ہے۔ اس کا عام زندگی سے سروکار رکھنے والے علوم سے براہ راست اور گہرا تعلق ہے۔ ہماری کتابیں ایسی ہونی چاہئیں جو طلبہ کی نظر کو اور اس کے اظہار کی صلاحیت کو محدود نہ کردیں۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

اسکولوں میں اردو ادب کا نصاب

ادب کی تعلیم کا مقصد قوتِ اظہار کی جِلا کرنا ہے۔ تسلیم شدہ اقدار کے تحت نئی نسلوں کے ذہن وکردار کی تربیت کرنا اور جمالیاتی احساس کو پروان چڑھانا ہے۔ عمومی اور نظری طور پر ان تینوں مقاصد پر بحث وگفتگو کرنا مشکل نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے کیونکہ ان پر سب کو اتفاق ہوگا۔ مسئلہ پیچیدہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی متعینہ وقت، مقام، افراد اور سماج کے تناظر میں ہم ان کی تفصیلات پر توجہ دینا شروع کرتے ہیں۔ جب یہ متعین شدہ مقاصد اپنی غیر معین شکل میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یعنی زمانے کی تبدیلیاں، مقامات کا فرق، افراد کا تنوع اور سماج کا تغیر، اظہار، اقدار اور جمالیاتی احساس کے حدود کو متعین بھی کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان حدود کو توڑنے کی ضرورت اور امکانات کو بھی فراہم کرتا ہے۔ نصابات کی تشکیل ایک نسل کے لوگ کرتے ہیں اور ان کے فائدے یا نقصانات دوسری نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ ہر نسل اپنی اقدار پروان چڑھانے اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے تعلیم کا استعمال کرتی ہے اور اسی کے مطابق نصابات بنائے جاتے ہیں۔ مگر جب آنے والا زمانہ اور اس کے ساتھ ابھرنے والی نسل بزرگوں کی توقعات کو پورا نہیں کرتی نہ کر سکتی ہے تو نصابات کی افادیت معرضِ بحث میں آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی نسل بھی اپنے آباواجداد کی توقعات کو پورا نہیں کر سکتی اور نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ توقعات بھی اکثر وقت گزرنے کے ساتھ بے کار اور باطل ہو جاتی ہیں۔ گذشتہ ایک صدی کے اندر تبدیلیوں کی تیز رفتاری، انسانی حقوق کے احساس اور جمہوری آزادیوں کے تصور کے فروغ کی بدولت یہ شعور بھی

پیدا ہوا ہے کہ نصابات میں صدیوں کی تسلیم شدہ قدروں کے تحفظ سے زیادہ آنے والی زبانوں میں ان کی ضرورت کو بھی اہمیت دی جانے لگی۔ مستقبل کے تقاضوں کا اندازہ بھی ہر نسل اپنے شعور کے مطابق ہی کر سکتی ہے۔ اور اسی کے مطابق اپنے بس بھر تعلیمی نصاب کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اب اردو کے نصابوں کو دیکھیے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے پس پشت ہمارے ہاں آئندہ ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ کم سے کم اور اپنے تصورات کے تحفظ کا رجحان زیادہ سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں نصابوں میں تبدیلیوں کی خواہش اور دعووں کے باوجود تبدیلیاں نہ ہو سکیں اور وہی اسباق، وہی مصنفین، وہی موضوعات اپنی پرانی شکل میں بار بار کتابوں میں آتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نصابات نئی نسل کے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے ذہن و زندگی سے چشمک کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کتابوں کو پڑھانے میں کسی کو دلچسپی نہیں رہ جاتی۔ جب نصابوں کا یہ حال ہوگا تو امدادی کتابوں کا بھی عالم ظاہر ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں اگر اردو پڑھنے والی نئی نسلیں فلمی، جاسوسی، رومانی اور جنسی ادب کی شکل میں جو کچھ بھی پا جائیں اس سے اپنے مذاق کی تسکین کریں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک طرح کی خود سوزی ہے۔ جس کا ارتکاب اردو دنیا کی عام پسماندگی کی بدولت بڑھتا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس کا ایک حل یہ ہے کہ ہم آج اپنے نصابوں میں روایتی اسباق کی جگہ جدید اور ہم عصر عہد کے ادب اور جدید اور ہم عصر زبان پر زیادہ زور دیں کہ یہ ہمارے آج کے طالب علموں اور کل آنے والے نوجوانوں کے ذہن و زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔ ان ہی کے تحت ان کے فہم و احساس کی تربیت ہوئی ہے اور انھوں نے اپنے اظہار کی صورتیں پائی ہیں۔ ہم نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا ہے اس لیے اس طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں کہ طلبہ کو عشق کے موضوع سے کس منزل پر آشنا کرایا جائے۔ اور اس کا حل یہ سمجھا جاتا ہے کہ چوٹی کے کلاسیکی شعراء کی عشقیہ شاعری سے عشق کے عنصر کو نکال کر خود شاعر کی صورت کو مسخ کر دیا جائے یا کلاس روم میں شب ہجر اور شب وصال کو نظر سے نیچی کر کے عشقِ حقیقی بنا کر پڑھایا جائے۔ اسی طرح قصیدے میں جو کچھ بھی پڑھایا جاتا ہے اس کا اخلاقی نقطۂ نظر سے جواز فراہم ہی نہیں کیا جا سکتا نہ کلاس میں کورس کے لیے اتنا وقت ہوتا ہے کہ اسکول کی سطح پر اس سماج کا پورا پس منظر اچھی طرح

طلبہ کے ذہن نشین کرایا جائے جس میں قصیدہ لکھا جاتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ بہادر شاہ ظفر یا شاہانِ اودھ کی جو تصویر اردو قصیدوں میں ابھرتی ہے اور جو تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہے اس میں کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا حل یہ سمجھا جاتا ہے کہ بس قصیدے کے مشکل الفاظ کے معانی سمجھا کر آگے بڑھ لیا جائے۔ استاد بھی کیا کرے۔ نصاب کی بنا پر مجبور ہے جو کتاب اسے دی گئی ہے وہی پڑھائے گا۔ کلاس روم سے باہر نکل کر دیکھیے تو وہی طالب علم جسے عشقیہ شاعری پڑھانا عمر اور اخلاقیات کے تقاضوں کے خلاف سمجھا جاتا ہے، وہ فلم، T.V. اور ریڈیو کے ذریعے ہی نہیں اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتا ہے وہ کلاسیکی اردو شاعری سے بہت آگے کے مناظر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سماجی اور نفسیاتی فضا میں اسے اپنی کلاس کے اسباق اس قابل بھی نہیں لگتے کہ ان کا مضحکہ اڑائے۔ وہ اپنی دنیا الگ بناتا ہے۔ جو ہمارے نصابات کے دائرے سے پرے کی مگر اس کے اپنے عہد کی دنیا ہے ہم جسے مسئلے کا حل سمجھتے ہیں دراصل طلبہ کے لیے ایک نیا مسئلہ ہوتا ہے جسے وہ اپنے طور پر حل کرتے ہیں اور جب ہمارا آمنا سامنا ان کے حاصل کیے ہوئے اس حل سے ہوتا ہے، تو ہم نئی نسل اور اس کی اخلاقیات اور گرتے ہوئے ادبی مذاق کا ماتم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔

اسکول کے طلبہ کے لیے ادب کا نصاب زیادہ تر جدید اور ہم عصر ادب پر مبنی ہونا چاہیے کیونکہ زبان، اظہار موضوع اور زندگی کے رویّوں کے اعتبار سے اس کا سابقہ اُسی دنیا سے ہے اور آئندہ بھی رہے گا جس میں وہ ادب تخلیق ہوا ہے۔ اقدار، زبان، اظہار، جمالیاتی احساس کی جلا کے نقطۂ نظر سے اس کی زندگی اور جدید ادب میں تضاد کم سے کم ہے اور اس میں اس کے مستقبل کی زندگی کے عناصر زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نثر و نظم کی مقبول اصناف کے ساتھ نئی اصناف جو آج کل نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں میں مقبول ہیں، ان کے ذریعے ادب کی تدریس کو زیادہ مفید، دلچسپ اور نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے۔ کلاسیکی ادب اور اس کے اہم پہلوؤں کو سینئر سیکنڈری اسکول کی سطح پر متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں امدادی کتب کے ذریعے بھی طلبہ میں ادب سے دلچسپی پیدا کرائی جا سکتی ہے

صغرا مہدی

اردو نصاب میں زبان و بیان کے مسائل

کسی زبان کی بقا کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے کہ اس کی تعلیم ہو اور مناسب ہو۔ جہاں تک اردو کا سوال ہے اس کی تعلیم بہت محدود ہے اور جن اسکولوں میں اردو پڑھائی جا رہی ہے وہاں نصاب اور طریقۂ تدریس دونوں ناقص ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو پڑھنے والے طلبا کو نہ زبان آتی ہے نہ ان میں کوئی ادبی ذوق پیدا ہوتا ہے۔ وہ کورس کے علاوہ ادب کا مطالعہ بالکل نہیں کرتے۔ وہ زبان پڑھتے ہیں مگر اس سے ناواقف رہتے ہیں، وہ ادب کے طالب علم ہوتے ہوئے بھی ادب سے بے بہرہ ہیں۔ وہ صحیح تلفظ کے ساتھ دو جملے بھی نہیں بول سکتے، نہ صحیح طریقے سے اپنی زبان میں اظہار خیال کرنے پر قادر ہیں۔ ہمارا نصاب اور طریقۂ تدریس دونوں غیر دلچسپ ہیں جو مضامین اور نظمیں کورس میں پڑھائی جاتی ہیں عام طور پر ان کا اندازِ بیان مشکل اور ثقیل الفاظ سے بوجھل ہوتا ہے یہ صورت حال اس لیے ہے کہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات صاف نہیں ہے کہ زندگی میں زبان کی کیا اہمیت ہے، زبان پڑھادی جاتی ہے کہ وہ اس نصاب میں شامل ہے۔ استاد نثر اس طرح پڑھاتا ہے کہ طالب علموں کو مشکل الفاظ کے معنی آجائیں، شاعری اس طرح کہ وہ شعر کا مفہوم سمجھ لے یا شعر کو نثر کر لے بلند خوانی، خاموش مطالعہ، شعر خوانی، املا، محاوروں کا استعمال۔ یہ چیزیں جو زبان کو جاننے کے لیے بہت ضروری ہیں اب اسکولوں میں ان کا چلن یا تو بالکل نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو بس نام کو۔ عام طور پر اسکولوں میں جو استاد زبان کی تعلیم دیتے ہیں وہ زبان سے خود بھی بہت اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور نہ وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے طریقۂ تدریس کو زیادہ دلچسپ اور کارآمد بنائیں

اسکول کی ابتدائی درجوں کی ریڈروں میں جو مشقیں دی جاتی ہیں ان کو بھی استاد سوچ سمجھ کر نہیں کراتے۔ نصاب کے علاوہ طالب علموں کو زبان سکھانے اور ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے جو وسیلے تھے مثلاً تحریری اور تقریری مقابلے، شعر خوانی، بیت بازی، مباحثے، مضامین لکھوانے کی مشق اب ان کا رواج بھی نہیں رہا ہے۔ اب اسکول اور کالجوں میں زیادہ تر غزل خوانی کے مقابلے ہوتے ہیں جن میں اکثر وہ طالب علم حصہ لیتے ہیں جن کی آوازیں اچھی ہوتی ہیں یا جو موسیقی کے طالب علم ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ہندی اسکرپٹ میں غزلیں لکھ کر گا دیتے ہیں۔ آج بھی ہمارے یہاں زبان کی تعلیم کا دار و مدار رٹن پد یا ہے

نصاب میں وہی کتابیں ہیں جو مدتوں سے چلی آرہی ہیں۔ جبکہ زمانہ کس قدر بدل گیا ہے طالب علم کی عام سمجھ اور معلومات پہلے سے بہت بڑھ گئی ہیں زبان کی استعداد کم ہوگئی ہے۔

نصاب بنانے والے یا ریڈریں مرتب کرنے والے لوگ ماہرین تعلیم اور پروفیسر ہوتے ہیں وہ لوگ پہلے کی دو چار ریڈروں کو سامنے رکھ کر تھوڑا سا ردّو بدل کر کے ان کو نئے سرے سے مرتب کر دیتے ہیں۔ اسی لیے بعض ادیبوں اور شاعروں کی جو چیزیں شامل ہوگئی ہیں وہ چلی آرہی ہیں بغیر اس کی طرف دھیان دیے کہ آج کے طالب علم کے لیے وہ دلچسپ معلومات افزا اور زبان کو سکھانے میں معاون ہیں یا نہیں۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اب سے بیس سال پہلے بلکہ پندرہ سال پہلے تک چھٹی کلاس کے طالب علم کی جو استعداد اور زبان کو سمجھنے کی صلاحیت تھی وہ اب نہیں رہی ہے مگر وہ اب بھی اس کلاس میں اقبالؔ کی نظم "چاند تارے" پڑھ رہا ہے۔

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے	تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر	ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا	چلنا چلنا، مُدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے	کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب	تارے، انساں، شجر، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟	منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟
کہنے لگا چاند، ہم نشینو!	اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن — آغاز ہے عشق، انتہا حسن

آپ ہی انصاف کیجیے اس نظم کا خیال، لفظیات اور ڈکشن آج کے چھٹی کلاس میں پڑھنے والے طالب علم کے لیے مناسب ہے؟ کیا وہ اس کو سمجھ سکے گا؟ اس سے لطف اندوز ہو سکے گا جو شاعری کی تدریس کا سب سے اہم مقصد ہے۔

اسی طرح چھٹی کلاس میں "ہماری زبان" کے عنوان سے ایک سبق ہے جس میں زبان کی تاریخ اور ادب کے ارتقا کو بیان کیا گیا ہے جس میں سید انشا کی وہ غزل بھی ہے

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں

صوفیانہ کلام شاعر کے رنگ اور نیچرل شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع سے بچّوں کو اگر واقف کرنا ہے تو اس کی زبان سادہ اور عام فہم ہونا چاہیے، اسی طرح ساتویں کلاس کی ریڈر میں عبدالحلیم شرر کا مضمون "لکھنؤ کی تہذیب" ہے۔ اس مضمون کا انداز بیان اور زبان دیکھیے:
"تہذیب دراصل ان اخلاقی تکلفات کا نام ہے، جن کو کوئی قوم تقاضائے شرافت سمجھنے لگے۔ آج کل اکثر ہم لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ ملنے جلنے میں چناں و چنیں اور معاشرت میں تکلفات ایک قسم کی فضول ریاکاری ہے، مگر یہ ان کی غلطی ہے یوں تو فضول ریاکاری لباس اور بود و باش کا انتظام اور بہیمیت کی زندگی کو چھوڑ کر انسانیت کی زندگی اختیار کرنے کے لیے عام امور فضول ریاکاری کہے جا سکتے ہیں۔" یہ مضمون کیا ساتویں کلاس کے طالب علم کے معیار کے مطابق ہے؟ لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں تو وہ کچھ جان لے گا مگر اس کو زبان سیکھنے میں کیا مدد ملے گی!
اسی طرح اس ریڈر میں ڈاکٹر عابد حسین کا مضمون "دو عینکیں" بھی نہ جانے کب سے چلا آ رہا ہے۔ یہ مضمون اپنے موضوع اور انداز بیان کی وجہ سے ساتویں کلاس کے طالب علموں کے لیے

فہم سے بالکل بالاتر ہے۔ اس کے برعکس نویں اور دسویں کی ریڈر میں موصوف کا ایک مضمون "گوتم بدھ" ہے جو اپنے انداز بیان اور زبان کے لحاظ سے بہت مناسب و موزوں ہے۔ اسی ریڈر میں اسی طرح کا ایک مضمون کبیر پر نہایت سلیس رواں اور شگفتہ نثر میں شامل کیا گیا ہے، انداز نہایت دلچسپ ہے۔ جو ڈاکٹر مظفر حنفی نے لکھا ہے۔ مکتبہ جامعہ کی تیار کرائی ہوئی ریڈر میں دہلی کے سب اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان ریڈروں کی تیاری میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ اردو کی تدریس طالب علم کے لیے ایک اکتاہٹ کا سبب نہ بن سکے۔ ہر سبق کے بعد لکھنے کی مشقیں دے رکھی ہیں جن کو اگر توجہ دے کر بچوں سے کرایا جائے، وہ ان کو زبان سیکھنے میں معاون ہوں گی۔ مگر ان پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ طالب علموں کا وہ معیار نہیں رہا۔ آٹھویں کلاس کا طالب علم کبھی اس مضمون سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا جس کا عنوان "جام جہاں نما کشمیر" ہے "خالقِ زمین آسمان نے ایک طبقہ کشمیر کو ساری خوبیوں کا مجموعہ بنایا ہے اور اس کی زمین کو جمیع اوصاف کا مجموعہ ٹھہرایا ہے یہ ملک کوہستان ہمالہ کے درمیان ہے، عجب اس کی شان ہے۔ اس خطّے کی تعریف جہاں تک کی جاے بجا ہے اور اس طبقے کی ثنا و صفت جس قدر ہو روا ہے"۔ اسی ریڈر میں سر سید احمد خاں کا مضمون "تعصب" اس تمہید کے ساتھ شامل ہے "ان کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل بات کو آسان اور سادہ زبان میں سمجھا دیتے ہیں"۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"انسان قواعدِ قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے وہ تنہا اتنے حوائج ضروری نہیں مہیا کر سکتا اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی، جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے **جو اس کے** ہم رائے ہوں مائل نہیں ہوتا۔ عقل اور قواعد قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور تمدّن اور معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت زیادہ آرام دہ اور زیادہ عزت کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے"۔

یہ بات بلا کسی شبہے کے کہی جا سکتی ہے کہ مذکورہ بالا مضمون ہرگز سر سید کی اس طرزِ تحریر کا نمونہ نہیں ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کا مضمون "گزرا ہوا زمانہ" جو اس چھٹی کلاس

کے لیے ہر طرح موزوں ہے اور تمہید جو بات سرسید کی تحریر کے بارے میں کہی گئی ہے اس کے مطابق ہے وہ دسویں اور گیارہویں میں کتاب کے حصۂ نثر میں ہے۔ اسی طرح مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" کا ایک ٹکڑا "دنیا کی بے ثباتی" کے عنوان سے ساتویں کلاس کی کتاب میں شامل ہے:

جائے عبرت سرائے فانی ہے — موردِ مرگ جو جوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام
جو تھے مشہور قیصر و فغفور — باقی ان کے نہیں نشانِ قبور

وغیرہ وغیرہ

ساتویں کلاس میں پڑھنے والا طالب علم نہ سمجھ سکتا ہے نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے جبکہ اسی موضوع پر اگر تلاش کیا جائے تو بہت اچھی نظمیں مل سکتی ہیں۔

اکبر الہ آبادی کی نظم "پانی" مدتوں سے اسکول کی ریڈروں میں چلی آ رہی ہے یا پھر ان کی کچھ رباعیات بڑی کلاسوں میں پڑھائی جاتی ہیں یا پھر باپ کا خط بیٹے کے نام۔ عشرتی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے۔ جبکہ اکبر کی کلیات کا مطالعہ کیا جائے تو ایسی چیزیں مل [illegible] جو پڑھنے میں بھی دلچسپ ہوں گی اور اکبر کے مخصوص رنگ سے بھی طالب علم واقف ہو سکیں گے۔

نویں کلاس میں پڑھائی جانے والی ریڈر معیار ادب اٹھائیے تو اس میں ایک ادیب کا مضمون غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ مضمون تو خیر ٹھیک ہے مگر موصوف کی غزلیں اور نظمیں اس کلاس کے طلبا کے لیے قطعاً غیر موزوں ہیں۔ ان کا نام غزل اور نظم کے میدان میں کوئی نمایاں مقام بھی نہیں رکھتا نہ ان کی غزل اور نظم کو جدید نظم و جدید غزل کا نمونہ کہا جا سکتا ہے مگر ان کی چیزیں شامل کرنا مرتب کی کوئی مجبوری رہی ہوگی، تو حضرات ہمارا ادب، ہماری تعلیم اور ہماری

روزمرّہ کی زندگی اسی طرح کی مجبوریوں کا شکار ہے۔

بات یوں ہے کہ اس پر تو ہم لوگ سراسیمہ ہیں کہ اردو اسکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی ہے مگر جہاں پڑھائی جا رہی ہے کیا پڑھائی جا رہی ہے اور کیسے پڑھائی جا رہی ہے، اس طرف ہمارا دھیان نہیں ہے! اس وقت اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ آج کل کے طالب علموں کے معیار اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اردو زبان و ادب کا نصاب از سرِ نو ترتیب جائے۔ اس میں زبان و ادب پڑھانے والے اساتذہ کو شامل کیا جائے اور جو لوگ نصاب بنائیں وہ پوری تلاش و جستجو محنت و غور و فکر سے کام لیں۔ نصاب میں تخلیقی چیزوں کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اور نصاب کے علاوہ زبان کو سکھانے کے اور وسیلے بھی اپنانے چاہئیں۔ یہ اردو کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اردو اکادمی نے اس طرف توجہ کی ہے۔

رشید حسن خاں

نصابی کتابوں میں املا، رموزِ اوقاف اور علامات کا مسئلہ

جس زمانے میں شاہ جہاں پور کے اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں اردو فارسی کے استاد کی حیثیت سے میں کام کر رہا تھا، اس زمانے کا ایک واقعہ ایسا ہے جسے شاید کبھی نہ بھلا سکوں۔ یہ بات ہے ۱۹۵۲ء کی۔ ساتویں درجے کے ایک طالب علم کی کاپی دیکھ رہا تھا۔ یہ طالبِ علم محنتی بھی تھا اور ذہین بھی۔ اُس نے ایک جملے میں "مجکو" لکھا تھا اور ایک دوسرے جملے میں "تماشہ"۔ میں نے دونوں لفظوں پر خط کھینچ دیا، "مجکو" کی جگہ "مجھ کو" اور "تماشہ" کی جگہ "تماشا" لکھ دیا اور یہ ہدایت کی کہ دس بار اِن لفظوں کی مشق کی جائے۔ سب لڑکوں نے اپنی اپنی کاپیاں دیکھیں اور رکھ لیں۔ اچانک وہ طالبِ علم، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، اٹھ کر میرے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ سر! آپ نے میرے لکھے ہوئے اِن دونوں لفظوں کو کیوں کاٹ دیا؟ میں نے بتایا کہ اِن دونوں لفظوں کا املا تم نے صحیح نہیں لکھا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ واپس گیا اور اپنی نصاب کی کتاب اٹھا لایا۔ کتاب لاکر اُس نے میرے سامنے رکھ دی اور کہا کہ سر! دیکھیے کتاب میں تو یہ دونوں لفظ اُسی طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح میں نے لکھے تھے۔ یہ کہہ کر اس نے جس نگاہ سے مجھے دیکھا، اُس کا نقش آج تک میرے دل پر محفوظ ہے۔ اُس کی زبان نے اور کچھ نہیں کہا، مگر اُس کی نگاہ نے بہت کچھ کہا۔ لڑکوں کے لیے تو ایسا موقع کبھی کبھی آتا ہے، درجے میں کانا پھوسی ہونے لگی کہ ماسٹر صاحب کو اِن لفظوں کا املا نہیں معلوم!!

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک میں اُس اسکول میں پڑھاتا رہا اور سات آٹھ سال کی اس

مدت میں اِس ایک خاص واقعے کے علاوہ بیسیوں دفعہ یہ ہوا کہ تختۂ سیاہ پر میں نے کوئی لفظ لکھا اور بعد کو معلوم ہوا کہ کتاب میں تو وہ دوسری طرح لکھا ہوا ہے۔ شروع کے سال دو سال کے تجربے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ جب تک نصاب کی کتابوں میں اور پڑھانے والے کی معلومات میں یکسانی نہیں ہوگی، اُس وقت تک یہی احوال رہے گا۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ شروع شروع میں بچّے کی آنکھیں جن صورتوں کو بار بار دیکھتی ہیں، ذہن اور یادداشت کے سادہ وصاف ورق پر وہ نقش اُسی طرح محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہی حال املا کا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں، جب املا کی خاص طور پر مشق کرائی جاتی ہے، یا لفظوں کی شکلوں کو ذہن نشیں کرایا جاتا ہے، کہیں کہیں بہت سے لفظوں کے ہجّے بھی کرائے جاتے ہیں، تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ لفظوں کی تصویر ذہن کے پردے پر اتر آتی ہے۔ کتاب میں جو لفظ جس طرح لکھا ہوا ہے، طالب علم اُس لفظ کو اُسی طرح لکھنا سیکھے گا۔ یا پھر یہ ہوگا کہ تختۂ سیاہ یا کاپی پر اُستاد جس لفظ کو جس طرح لکھے گا، شاگرد اُس لفظ کا وہی املا سیکھے گا۔ اِس کا سیدھا سا مطلب یہ ہوا کہ ابتدائی نصابی کتابوں کو مرتب کرنے سے پہلے بنیادی ذخیرۂ الفاظ کے املا کا تعین کرلیا جائے اور پھر اُس سلسلے کی ساری نصابی کتابوں میں ہر لفظ کا وہی ایک املا رکھا جائے۔

اِسی کے ساتھ یہ بھی اُسی قدر ضروری ہے کہ اِن کتابوں کو پڑھانے والا بھی الفاظ کو اُسی طرح لکھتا ہو، جس طرح وہ کتاب میں چھپے ہوئے ہیں۔ اِس مکمل یکسانی کے بغیر ساری محنت بے کار جائے گی۔ فرض کر لیجیے کہ کتاب میں "بھروسا" لکھا ہوا ہے۔ جو استاد اُس کتاب کو پڑھاتا ہے اُس نے تختۂ سیاہ پر یا اصلاح کے سلسلے میں طالبِ علم کی کاپی پر "بھروسہ" لکھا اور یوں لکھا کہ اِس بے چارے استاد نے اِس لفظ کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اِسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ اب ذہن بے ساختہ اُسی نقش کی تکرار کرتا ہے اور قلم سے بلا تکلّف اور بلا تامّل وہی نقش بنتا ہے۔ اِس صورت میں وہ طالب علم کیا کرے گا؟ ذہن میں الجھن پیدا ہوگی یا نہیں؟ اُس بچّے کی سمجھ میں آخر یہ بات کیسے آئے گی کہ وہ اِس لفظ کو کس طرح لکھے؟ اُس طرح لکھے جس طرح کتاب میں چھپا ہوا ہے، یا اُس طرح لکھے جس طرح اُس کے استاد نے اپنے قلم سے لکھا ہے!

اِس سلسلے کا ایک پہلو اور بھی ہے، چوتھے پانچویں یا چھٹے درجے میں طالب علموں نے

لکھنے کی مشق کی اور لفظوں کو اُسی طرح لکھنا سیکھا، جس طرح کتاب میں وہ لفظ چھپے ہوئے ہیں
جب وہ نویں اور دسویں درجے میں پہنچے اور یہاں جو نصاب کی کتابیں ملیں، اُن میں ادب ہی
ادب تھا اور شاعری ہی شاعری۔ اِن کتابوں کو مرتب کرنے والے بھی مختلف لوگ تھے اور ان کی
کتابت بھی الگ الگ لوگوں نے کی تھی۔ اب یہ منظر سامنے آتا ہے کہ نثر کی کتاب میں ایک لفظ
ایک طرح لکھا ہوا ہے اور نظم کی کتاب میں وہی لفظ دوسری طرح لکھا ہوا ہے اور یہ اختلاف
بس دو چار لفظوں تک محدود نہیں۔ مثلاً ایک کتاب میں "گذرنا" لکھا ہوا اور دوسری میں
"گزرنا" یا مثلاً ایک ہی کتاب کے ایک سبق میں تو "ہرج" لکھا ہوا ہے اور دوسرے میں "حرج"
ہے۔ طالب علموں کو کیا معلوم کہ ہماری کتابوں میں عام طور پر مندرجات کا تعین تو اساتذہ کیا کرتے
ہیں، لیکن الفاظ کے املا کا تعین کاتب صاحبان کیا کرتے ہیں۔ ایک کتاب کی کتابت اگر دو کاتبوں
نے کی ہے تو بہت سے لفظوں کا املا باہم مختلف ہوگا، کیونکہ ہر کاتب لفظوں کو اُسی طرح لکھتا
ہے جس طرح اُس کے استاد نے اُسے مشق کرائی ہے اور یہ اساتذہ بس یہ دیکھتے ہیں کہ فنِ خوش نویسی
کے لحاظ سے دامن اور دائرے ٹھیک بنے ہیں یا نہیں، لفظوں کے املا کی صحت یا عدمِ صحت
اُن کے دائرۂ کار سے باہر کی چیز ہے۔

آٹھویں درجے تک آتے آتے طالبِ علم کو یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھی حرف
کے بدلنے سے معنی بھی بدل جایا کرتے ہیں۔ یہ بات خواہ اُسے باقاعدہ پڑھائی نہ گئی ہو، مگر بار
بار ایسے لفظوں کو دیکھنے پڑھنے اور پھر لکھنے سے یہ احساس خود بہ خود پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً اُس کی
آنکھوں نے یہ دیکھا کہ "چڑیا دانہ لائی" میں "دانہ" لکھا گیا ہے اور وہ "بہت دانا تھا" میں
"دانا" لکھا گیا ہے۔ غرض کہ ایسی بہت سی مشقوں سے یہ شعور ذہن میں کسی نہ کسی حد تک پیدا
ضرور ہو جایا کرتا ہے اور اُستاد کا ذرا سی توجہ دلا دینا اِس شعور کو پختہ تر کر سکتا ہے۔ لیکن اگر
صورت یہ ہو کہ مثلاً استادِ محترم "شمع معمہ" حل کرتے کرتے خود بھی "معمہ" لکھنے لگے اور اپنے
طالبِ علم کو بھی اس لفظ کا یہی املا سکھایا اور اُس نے سیکھ لیا۔ جب نویں یا دسویں درجے
میں اُس نے نصاب میں فانی کی غزل کا یہ مطلع پڑھا:

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

اتفاق یہ کہ کتاب میں بھی "معمہ" چھپا ہوا تھا، تو اِس شعر کی حد تک تو کام چل گیا، کچھ احساس نہیں ہوا، نہ کچھ گڑبڑ ہوئی۔ اب اتفاق سے آگے چل کر اُس نے غالب کا یہ مصرع پڑھا ع

عبرت طلب ہے حلِ معمائے آگہی

چونکہ اُس کا قلم تو "معمہ" لکھنا سیکھ چکا ہے، اِس لیے یہاں بھی اس کے قلم نے "معمۂ آگہی" لکھا اور یہاں گڑبڑ پیدا ہوئی کہ مصرع بحر سے خارج ہو گیا اور اب یہ بات سامنے آئی کہ اصل لفظ تو "معما" تھا، اُس کو "معمہ" لکھ کر یہ ساری مصیبت مول لی گئی۔ یا مثلاً بچّے نے نصابی کتاب میں "تماشہ" چھپا ہوا دیکھا، اُستادِ محترم بھی اتفاق سے اِسی طرح لکھتے رہے اور لکھاتے رہے۔ پھر جب دسویں درجے کی کتاب میں اُسے سودا کی وہ غزل پڑھنا پڑی جس کا ایک شعر یہ بھی ہے:

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

اب وہ حیران ہو سکتا ہے کہ ہم نے تو "تماشہ" لکھنا سیکھا تھا، لیکن یہاں تو "تماشائے دیر و حرم" میں "تماشا" آیا ہے اور وہ کوئی فیصلہ شاید ہی کر سکے۔ یا جیسے ایک لفظ ہے "سرھانا" اس میں ہائے مخلوط ہے۔ کتاب میں اگر بچّے نے "سرہانا" پڑھا اور اسی طرح لکھنا سیکھا اور اُستاد نے بھی اِصلاح نہیں کی، اور طالب علم کے ذہن پر اِس لفظ کے املا کی یہی تصویر نقش ہو گئی۔ آٹھویں درجے تک کام چل گیا اور بات بن گئی، مگر اس کے بعد آگے چل کر جب اُسے میر کا کلام نصاب میں پڑھنا پڑا اور اُس نے میر کا یہ مشہور شعر پڑھا:

سرھانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اور پرانی عادت کے مطابق اُس نے جب اس شعر کو لکھا تو اس میں "سرہانا" لکھا، تو اب یہاں بات بگڑ گئی کہ مصرع بحر سے خارج ہو گیا۔ جب تک "سرھانے" نہیں لکھا جائے گا، مصرعے کا وزن درست نہیں ہو گا۔

زبان کی تعلیم کے شروع میں طالب علم حرفوں اور لفظوں کی صورت شناسی کے عمل سے گزرتا ہے۔ جن لفظوں کو وہ پڑھتا ہے، اُن کے معنی تو وہ جانتا ہی ہے، اِس طرح ابتدائی تعلیم میں

اصل حیثیت لفظوں کی صورت سے روشناس ہونے کی ہوتی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو املا کی بنیادی حیثیت ہے! املا کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ وہ لفظوں کی صحیح تصویر کشی ہے۔ لفظ بنتا ہے حرفوں سے، اگر ہم نے قطعی طور پر یہ تعین نہیں کیا کہ کون سا لفظ کن حرفوں سے مل کر بنا ہے، تو پھر صحیح تصویر کشی کا تصور باطل ہو کر رہ جائے گا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اِس قدر بنیادی مسئلے کو ہم نے اب تک اُس توجہ کا مستحق نہیں قرار دیا ہے جو اس کا حق ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچے شروع ہی سے لفظوں کی صحیح شکل صورت سے واقف ہو تو یہ لازم ہو گا کہ ابتدائی درجوں کے لیے جو کتابیں مرتب کی جائیں، ان میں صحتِ املا کی بنیادی حیثیت اور اہمیت کو ملحوظ رکھا جائے۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ نصابی کتابوں میں رموزِ اوقاف کے استعمال کی طرف ہمارے یہاں کم سے کم توجہ دی گئی ہے، حالاں کہ اِس کے التزام کی سخت ضرورت ہے۔ آٹھویں درجے سے نصاب میں اچھے ادبی اسباق شامل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور نویں دسویں درجے میں پوری نصابی کتاب، ایک طرح ادبی کتاب بن جاتی ہے۔ طالبِ علم بارھویں درجے کا نصاب بھی پڑھ چکا ہوتا ہے، مگر اس کی آنکھیں آشنا نہیں ہو پاتی ہیں سوالیہ نشان سے، ندائیہ نشان سے اور کاما سے۔ بیانیہ کی علامت سے بھی وہ آشنا نہیں۔ جب کہ ہم میں سے بیشتر افراد اس بات کو مانیں گے کہ کلاسکی نثر اور شاعری کے پڑھانے میں کبھی کبھی مشکل یوں بھی پیش آیا کرتی ہے کہ اجزائے جملہ کا تعین صحیح طور پر نہیں ہو پاتا۔ شاعری میں تو مفہوم کی تشکیل اور توضیح میں رموزِ اوقاف کو بہت دخل ہے۔ جس طرح ہم مشدّد حرف پر تشدید لگانا ضروری نہیں سمجھتے اور اضافت کا زیر لگانا لازم نہیں سمجھتے، اُسی طرح استفہامیہ یا ندائیہ یا کاما کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں اور یہ بڑی غلط فہمی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ طالب علم عبارت میں جملے کے ٹکڑوں کو صحیح طور پر ادا کرنے اور متعین کرنے کے رمز سے اچھی طرح آشنا ہو جائے تو ہم کو نصابی کتابوں میں توقیف نگاری کا التزام کرنا چاہیے۔ شاعری میں تو یہ ازبس ضروری ہے، خاص کر کاما، کہ بہت سے اشعار کے مفہوم کا تعین زیادہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اگر کاما کو استعمال کیا جائے اور اس کی مدد سے اجزا کو الگ الگ کر دیا جائے۔

صحتِ املا اور رموزِ اوقاف کے التزام کے ساتھ ساتھ نصابی کتابوں میں مختلف علامات کو بھی لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے۔ واو اور یے کی معروف اور مجہول آوازوں کے فرق کو ظاہر کرنے کے لیے علامتوں کا استعمال ازبس ضروری ہے۔ یہی صورت غنہ آواز کی علامت کی ہے۔ ہمیں یہ بات مان لینا چاہیے کہ ایک اچھی نصابی کتاب وہ ہوگی جس میں مناسب طور پر ان سب امور کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اب سے پہلے جب زبان کی تعلیم کا معیار آج کل کے مقابلے میں بہتر ہی نہیں، بہت بہتر تھا، اُس وقت پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی مرتّب کرائی ہوئی جو کتابیں چھپتی تھیں اور جو آج بھی محفوظ ہیں۔ کتاب خانوں میں اُن میں آپ ایسی بہت سی علامتوں کو شامل پائیں گے۔ اور آج جب کہ زبان کی تعلیم کا معیار بہت گر گیا ہے اور اُس کے مزید گرنے کی اچھی خاصی توقع ہے، اس حال میں ہم اُن اجزا کو چھوڑ بیٹھے ہیں جن کی مدد سے زبان کی تعلیم میں مدد مل سکتی ہے اور طالبِ علم کو پڑھنے اور سمجھنے کی بعض آسانیاں میسّر آسکتی ہیں۔

ایک بات اور: یہ بات طے ہے کہ تلفّظ کے مسائل املا سے الگ ہیں۔ اِس بات کو ماننے کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ زبان کی تعلیم کا احوال اب کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ہمیں اِس کی توقع نہیں کرنا چاہیے کہ استاد فارسی پڑھ کر آئے گا اور طالبِ علم اس گھر سے آئے گا جہاں اس کی تربیت مدرسے میں آنے سے پہلے ہو چکی ہوگی۔ یہ تو اب "افسانۂ شبِ گذشتہ" ہے اور افسانہ ہی رہے گا۔ اِس پر نہ مرثیہ پڑھنے کی ضرورت ہے نہ واویلا کرنے کی۔ ہاں ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ نویں دسویں اور گیارھویں درجے کی کتابوں میں ضروری لفظوں پر اعراب لگا دیں۔ عربی فارسی کے ایسے لفظ جو عام طور پر استعمال میں نہیں آتے یا استعمال میں تو آتے ہیں، مگر جن کے تلفّظ میں اشتباہ ہو سکتا ہے یا غلطی ہو سکتی ہے، ایسے لفظوں پر لازماً زیر زبر لگا دیے جائیں۔ آپ اِس نظر سے فہرست بنانے بیٹھیں تو یقین کیجیے کہ ہر کتاب میں سو دو سو لفظ ایسے ضرور مل جائیں گے جن کے تلفّظ کے تعیّن کی ضرورت ہوگی اُستاد کے لیے بھی اور شاگرد کے لیے بھی۔ نصابی کتابیں تیار کرتے وقت اس کا التزام کیا جائے کہ ایسے لفظوں پر اعراب ضرور لگائے جائیں۔ اِسی طرح اس کو بھی لازم قرار دینا چاہیے کہ اضافت کے زیر ہر جگہ لگائے جائیں۔ اب ہم کو یہ توقّع نہیں کرنا چاہیے کہ

اس مقام پر اضافت کو اٹکل سے پڑھ لیا جائے گا۔ اضافتوں کو جس ناواقف کارانہ بے دردی کے ساتھ تباہ کیا جاتا ہے وہ اب عام بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اضافت کے زیر تو لازمی طور پر ہر جگہ لگائے جائیں۔

اگر ہم املا کی صحت، تلفّظ کے تعیّن، توقیف نگاری کے التزام اور علامات کے استعمال کو جزوِ لازم قرار دیں نصابی کتابوں کی تیاری کے عمل کا، تو اُس صورت میں طلبہ کو پڑھنے، لکھنے اور سمجھنے میں بہت سی ایسی آسانیاں مل جائیں گی جن سے وہ اب تک محروم رہے ہیں اور ہم سب کو کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ اُن کی اِس محرومی کے ذمّے دار ہم ہیں۔ ہمیں یہ بھی مان لینا چاہیے کہ جہاں تک نصابی کتابوں کی تیّاری اور طباعت کا تعلّق ہے تو اکثر اور بیشتر یہ دونوں کام اُسی طرح کیے جاتے رہے ہیں جس طرح پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ٹھیکے دار سرکاری عمارتیں بناتے ہیں۔ اگر اس سیمینار کے نتیجے میں ہم سب عملی طور پر اس کا کفّارہ ادا کر سکیں تو یہ بڑا کام ہوگا۔

ظہیر احمد صدّیقی

اردو نصاب میں کلاسکیت کی ضرورت اور مسائل

آج ملک جن مسائل سے دوچار ہے، ان میں تعلیم اور طریقِ تعلیم کا مسئلہ بہت اہم ہے مگر افسوس ہے کہ سب سے کم توجہ ہمارے نظام تعلیم کی طرف ہے۔ تعلیم کی فراوانی اور نظام تعلیم کی ابتری اس نے پورے ملک کا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے تمام شعبوں کے مقابلے میں اس کو امتیاز حاصل ہے اور اس کی افادیت کا تصور اس بات سے لگائیے کہ اس کی سرحدیں زندگی کے تمام شعبوں سے جا کر مل جاتی ہیں۔ حکومت نے ہر میدان میں نمایاں طور پر ترقی کے امکانات کو فراہم کر دیا ہے اور ملک کا پورا سرمایہ ہنگامی حالات پر خرچ ہو رہا ہے مگر بد قسمتی یہ ہے کہ تعلیم کی طرف سے بے توجہی ملک کے مستقبل کو تاریک سے تاریک تر بنا رہی ہے تعلیم کی فراوانی یہ کہ ہر قریے اور قصبے میں درسگاہوں کا اہتمام ہے اور ارزانی یہ کہ معیار روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے۔

تعلیم ہی سے وابستہ ایک سوال ہمارے نصاب کا ہے۔ معیاری نصاب کی تکمیل اور اس کی فراہمی آج استاد اور طالب علم دونوں کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ نصاب کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ گھٹیا اور فرسودہ نصاب کی شمولیت صرف طالب علم کا وقت ہی ضائع نہیں کرتی بلکہ اس کے ذہن کو بھی زنگ آلودہ بنا دیتی ہے اس کا غالبًا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نصابوں کی تکمیل کبھی صوبے کی عصبیت، کبھی عقیدے اور مسلک کی رجعت پسندی، کبھی ذاتی پسند اور ناپسند کا شکار ہو جاتی ہے۔ بہر نوع نصاب کا مسئلہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ اس کے لیے جدوجہد ہی نہیں بلکہ ایسے

عناصر سے شاید جہاد بھی کرنا پڑے جو نصاب کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

نصاب کی تدوین میں ایک اہم منزل اس کے انتخاب کی ہوتی ہے اور اس انتخاب میں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نصاب کے ذریعے ہم طالب علم کو کیا دینا چاہتے ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب مل جائے تو ہمارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ نصاب کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ طالب علم کو اُسی کے عہد سے روشناس کرایا جائے۔ اس بدلتے ہوئے نظام کے ادبی، تعلیمی، سماجی سیاسی، اقتصادی اور سائنسی مزاج سے اُس کو اس حد تک ضرور آشنا کر دینا چاہیے کہ وہ اپنے عہد میں اجنبی نہ معلوم ہو۔ صرف اپنے ہی عہد کی آگاہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ جو ماضی سے وابستہ ہے اس کا ادراک بھی ضروری ہے اور یہاں سے ہمارے کلاسیکی ادب کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

ادب کے مطالعے میں کلاسکیت کو ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ قبل اس کے کہ نصاب میں کلاسکی ادب کی شمولیت کی بات کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر علمائے ادب نے کلاسکیت کی جو تعریف کی ہے اس کا ذکر کر دیا جائے۔

۱۔ کلاسکیت کا موضوع بنیادی اور اساسی ہوتا ہے۔

۲۔ کلاسکیت کا تعلق ان اخلاقی اقدار سے ہے جو اپنے وجود کو تو منواتی ہیں مگر اس کو کسی پر تھوپنے کی قائل نہیں۔

۳۔ وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہے۔

۴۔ اس میں ایک قسم کی رومانویت ہوتی ہے جو اپنے قاری کو پروپیگنڈے کے خشک میدان سے نکال لے جاتی ہے۔

۵۔ وہ ایک ایسی رومانویت ہے جو بہتر شعور پیدا کرتی ہے۔

۶۔ کلاسکیت ایک عہد کا دوسرے عہد سے اور ایک ادیب کا دوسرے ادیب سے رشتہ استوار کرتی ہے۔

بغیر کسی تلاش و جستجو کے چند مختلف اقتباسات پیش کیے گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے نصاب، جو موجودہ سائنسی دور میں سانس لے رہے ہیں، ان میں کلاسکی ادب کی کیوں ضرورت ہے۔

کلاسکی ادب کا تعلق زندگی کے بہت سے شعبوں سے ہے اور ہر شعبے میں اس کی ہمہ گیری مسلم ہے

مثلاً حسن وعشق کو لے لیجیے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کے اندر جمالیاتی ذوق ابھارتا ہے۔ دل کو دردمند اور گداز بناتا ہے۔ وہ جہاں بھی حسن دیکھے گا اس سے متاثر ہوگا۔ خواہ وہ حسن انسان کے اندر ہو یا کسی فطری منظر میں، وہ حسن قطب مینار کے جلال میں ہو یا تاج محل کے جمال میں۔ وہ ان سب کو زندگی کا ناگزیر حصہ خیال کرتا ہے۔ تصورِ حسن وعشق کے ساتھ ساتھ ہماری کلاسکیت کا گہرا تعلق دوسری نفسیاتِ انسانی سے بھی ہے۔ خوشی اور غم۔ محبت اور نفرت۔ سکون اور بے قراری یہ سب کلاسکی ادب کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر نصاب کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ وہ انسانی نفسیات کو سمجھے تو ہم کلاسکی ادب کے اس مزاج کو کیوں کر فراموش کر سکتے ہیں؟

کلاسکیت ایک ایسی چھلنی ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلو اور گوناگوں اقدار چھن کر ادب میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ مواد کا انبار نہیں ہے جس میں اشیا ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوگئی ہوں۔ یہ ترتیب وتدوین نصاب کو معاملات کو برتنے کا سلیقہ سکھاتی ہے، جذبے کی شدّت کے باوجود اس کو بے لگام نہیں ہونے دیتی۔ یہ اپنے اسلوب میں متانت اور اعتدال پیدا کرتی ہے اور اسی اعتدال پسندی کا نام کلاسکیت ہے۔ اب ذرا اس معیار کو ہماری تعلیمی زندگی کی ضروریات سے ہم آہنگ کر کے دیکھیے تو پتہ چلے گا کہ ہمارا کلاسکی ادب زندگی کے ہر شعبے کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا ایک مخصوص زاویۂ نظر ہے مگر اس مخصوص زاویۂ نظر کی ہمارے زمانے میں ضرورت رہے گی۔ اس کا اسلوب ہر زمانے میں زندگی کی قدروں کو پیش کرتا رہے گا۔ اس لیے وہ کسی زمانے میں اجنبی نہیں معلوم ہوگا۔ یہی ہمارے نصاب کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے۔

پروفیسر محمد حسن نے ایک جگہ لکھا ہے "کلاسکیت نے انسانی زندگی اور اس کے تمام ترشعبوں کے اصول وضوابط ترتیب دیے۔ حسن، جمالیات، فن اور زندگی کے محوروں کا پتہ لگایا۔" آگے بڑھ کر لکھتے ہیں۔ "کلاسکیت عقلیت کا نشان تھی، اصول پرستی اور ترتیب کی قائل تھی۔ اس نے زندگی اور اس کے حسن کو چند گنے چنے محدود دائروں میں اسیر کر لیا تھا۔" ڈاکٹر محمد حسن کا یہ فیصلہ یک طرفہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کلاسکیت ایک مخصوص نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہے مگر اس کے دائرے کو محدود نہیں کہا جا سکتا۔ ماضی کا وہ تمام لٹریچر جو دکنی ادب سے ہوتا ہوا داغ پر آکر منتہی ہوتا ہے اس میں زندگی کی وہ آوازیں سنائی دیتی ہیں جن کو شاید اس خوبصورتی اور تاثر کے ساتھ دورِ حاضر کا ادیب بھی

پیش نہ کر سکا ہو۔ بقول عبادت بریلوی "کلاسکیت اسے (ادب کو) جدت کی راہوں پر چلاتی ہے فن کی نئی منزلوں سے روشناس کرتی ہے اور اسی کے باعث اس کے فن کی رگ رگ میں نیا خون موجیں مارنے لگتا ہے۔" میر کی غزل، سودا کا قصیدہ، میر حسن کی مثنوی، انیس کا مرثیہ، نظیر کی نظمیں، غالب کی فکر مومن کا تغزل، داغ کا چلبلاپن یہ کلاسکی شاعری کے مختلف روپ ہیں اور ان میں زندگی ہنستی، بولتی، روتی، چھیڑتی اور گدگداتی نظر آئے گی۔ اگر ہم اپنے اس سرمایے سے اپنے نصاب کو محروم کر دیں گے تو نہ صرف ماضی سے رشتہ ٹوٹ جائے گا بلکہ مستقبل کی تعمیر کے امکانات بھی ختم ہو جائیں گے اور اس عہد کی سماجی زندگی سے ہمارا رشتہ اچانک ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے اس عہد میں کلاسیک کا یہ عمل ہمارے نصاب کے لیے ضرورت بن گیا ہے۔ مادی ترقی کے باوجود انسان ذہنی طور پر اپنے آپ کو دیوالیہ محسوس کر رہا ہے، اس کو اگر سکون میسر ہو سکتا ہے تو ان اخلاقی اقدار میں جو رنگ، نسل اور قومیت میں محدود نہ ہوں۔ ادب پروپیگنڈا نہ ہو مگر اس کی گرفت اتنی شدید ہونا چاہیے کہ زمانے کے حوادث اس کو متاثر نہ کر سکیں استاد کو جب معلم اخلاق کہا گیا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کر رہا ہے جو اپنی کلاسکی روایات کا احترام کرنا جانتا ہے اور یہیں سے تہذیب و تمدن کی ایک ایسی بنیاد پڑ جاتی ہے جو دوسری روایات سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ عابد علی عابد نے بجا طور پر لکھا ہے "کلاسکیت جہاں ادب کو اخلاقی تبلیغ کا آلۂ کار نہیں بناتی وہاں ادب کے ذریعے اخلاقی نظام کا قلع قمع بھی نہیں کرنا چاہتی۔"

اب تک ذکر کلاسکی ادب کی افادیت اور اہمیت کا تھا مگر اس راہ میں پیدا ہونے والے مسائل کا بھی ذکر ضروری ہے اس لیے کہ آج ہر شخص جو سائنس کی دنیا میں سانس لے رہا ہے وہ سوال کرتا ہے کہ ہم ادب کیوں پڑھیں؟ ایک دوست نے سوال کیا کہ آج جب انسان چاند پر پہنچ کر اس کی سیاہ داغدار زمین کو دیکھ چکا ہے تو آپ اب بھی اس کو محبوب کے چہرے سے تشبیہ دیں گے؟ لہٰذا مسئلے کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دماغ کے ان جالوں کو صاف کر کے اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ چاند اردو کی کلاسکی شاعری کے لیے اب محض چاند نہیں ہے بلکہ وہ ایک علامت بن چکا ہے اور علامتیں اپنے اندر معانی کا خزانہ رکھتی ہیں۔

ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ کلاسکی ادب کو پڑھا کس طرح جائے۔ بات صرف بلند خوانی کی نہیں ہے بلکہ اس ادب میں جو اشارے اور تلمیحات ہیں ان کی واقفیت کا سوال ہے۔ فسانۂ آزاد یا

سودا کے قصائد کی مثال لیجیے۔ ان تخلیقات میں اس عہد کی جو جھلکیاں اور سماجی کش مکش ہے اور ان کا اظہار اشاروں اور کنایوں کے ذریعے ہے، اس کا ادراک کیوں کر ممکن ہے۔ مصنّف یا شاعر رعایت لفظی سے فقرے میں جو وسعت اور معنویت پیدا کرتا ہے اس کو کس طرح سمجھا جائے۔ اس لیے کہ ایک محدود دائرے میں سوچنے والا ذہن اس معنویت کو اجنبی کی نظروں سے دیکھے گا۔

کلاسکی ادب کے مطالعہ کرنے والے کو ماضی کے اوراق کو اس طرح پڑھنا پڑے گا کہ اس کا کوئی لفظ چھوٹنے نہ پائے۔ یہ کام آسان نہیں ہے اس لیے کہ علامتیں اپنے ماحول کی پروردہ ہوتی ہیں اور زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے معنی بھی بدلتی جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے وابستہ بھی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جلسے میں ایک کرم فرمانے مشورہ دیا تھا کہ اب نصاب میں غزل کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ یہ صنف ہمارے عہد کے مسائل کے اظہار میں عاجز ہے تو بے ساختہ یہ مصرع زبان پر آیا تھا۔

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجا ست

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے مگر اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے تجرباتی دور کی زد میں آکر ہماری کلاسکی شاعری اور نثر کو نقصان پہنچا ہے۔ کسی نے قصیدے پر ضرب لگائی تو کوئی غزل میں لب و رخسار کی باتیں سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دور از کار علامتوں نے اردو شاعری کی علامتوں کو ان کے اصل مفاہیم سے دور کر دیا۔ ترقی پسندی کے طوفان میں بعض لوگوں پر ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے کہ وہ ہر برٹ ریڈ کے اس خیال کے حامی نظر آنے لگے تھے کہ شہدا کے خون پر کلاسکی طرز تعمیر کا ستون نصب ملے گا۔ مگر جلد انھوں نے محسوس کر لیا کہ کلاسکیت سے رشتہ منقطع کرنے کی صورت میں راستے سے بھٹک جانے کا ڈر ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جدید شعرا میں عظمت انہی کو حاصل ہے جنھوں نے اپنا رشتہ کلاسکیت سے نہیں توڑا ہے۔

نثری شاعری کی بے راہ روی نے کلاسکی ادب کے پڑھنے والوں کو آزمائش میں ڈال دیا۔ سہل الحصول شاعری نے کلاسکیت کا بازار کچھ لمحات کے لیے مندا کر دیا۔ سمندر کی تہہ سے موتی نکالنے کے مقابلے میں ساحل سمندر کی کنکریوں کو حاصل کرنا زیادہ دل نشیں محسوس ہونے لگا یہی

وجہ ہے کہ وہ ادب کو حساب کے فارمولے سے حل کرنے کی کوشش کرنے لگے اور جمالیاتی قدروں سے دور ہو گئے۔ ایک دوست نے بڑی عارفانہ بات کہی تھی کہ اگر میر، غالب، اقبال وغیرہ کے دیوان کبھی یک لخت کسی سیلاب میں بہہ کر فنا ہو جائیں جب بھی ہم اپنے طلبہ کو کسی سطحی شاعر کا کلام نہیں پڑھائیں گے۔

اس مختصر مضمون کے آخر میں پھر اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا تھا کہ کلاسکیت کا ادب سے اور ادب کا زندگی سے اتنا گہرا ربط ہے کہ اگر اس مثلث کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ ایک بہت بڑا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ ایسے ادب کی مثال اس لاش کی سی ہوگی جو ثابت و سالم نظر آنے کے باوجود زندگی اور روح سے محروم ہے۔

شمیم حنفی

اردو نصابوں میں جدید ادیبوں اور شاعروں کی نمائندگی کے مسائل

اس موضوع پر سوچ بچار شروع کرنے سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ہم کس سطح کے نصاب کی روشنی میں ان مسائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اردو شعر و ادب طلبا کو ابتدائی جماعتوں سے اعلا ترین درجات تک پڑھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر سطح یا ہر درجے کے طلبا کی ذہنی زندگی اور ضرورتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ ابتدائی جماعتوں میں ادبی نگارشات کی حیثیت ایک لسانی مرکّب کی ہوتی ہے۔ یہاں ادب پڑھتے وقت طالب علم دوہری آزمایش سے گزرتا ہے۔ ایک تو الفاظ یا جملوں کے حقیقی معنی کو سمجھنے کی آزمایش دوسرے جملوں یا الفاظ کی ترتیب سے وجود میں آنے والے شعر یا کہانی کے مُرادی مفہوم تک پہنچنے کی آزمایش۔ ایسی صورت میں ادب کا نصاب ایک طرح کی تنویتی مقصدیت کا پابند ہوتا ہے۔ ابتدائی درجات میں نہ تو اس قسم کی بحثیں اٹھائی جا سکتی ہیں نہ طلبا ایسی بحثوں کے رموز کو سمجھ سکتے ہیں کہ ادبی اظہار میں لفظ و معنی، بیان اور تجربے یا مواد اور ہیئت کی ثنویت کا تصور ناقص ہے۔ ادب پڑھنے والے کے لیے اہمیت دراصل اُس عضوی وحدت کی ہوتی ہے جو لفظ و معنی یا ہیئت و مواد کی یکجائی اور دونوں کے باہمی عمل کا حاصل ہوتی ہے۔ ادبی فکر اور سماجی فکر کے ضابطے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں یا یہ کہ ادب کی جمالیات ہماری روزمرّہ منطق کی پابند نہیں ہوتی، وغیرہ وغیرہ۔

ثانوی درجات سے آگے ہی وہ منزل آتی ہے جہاں ادب کو ادب کی طرح پڑھایا جانا ممکن ہے۔ اسی منزل تک پہنچنے کے بعد ادب کے استاد اور طالب علم میں مکالمے کی نوعیت کوئی بامعنی شکل اختیار کرتی ہے اور اسی منزل پر ادب اور غیر ادب یا ادبی زبان اور غیر ادبی زبان کے فرق و امتیاز کی کچھ

وضاحت استاد اور طالب علم دونوں کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔ اس فرق کی نشاندہی کے بغیر ادب کا استاد طالب علم کو نہ تو اپنے تجربے میں شریک کر سکتا ہے نہ ہی اُس تجربے میں جس کی ترسیل پڑھائے جانے والے ادب پارے سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ تدریس کا عمل ایک ذہنی، حسّی اور جذباتی رفاقت کا حامل ہے، اسی منزل سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اس سے پہلے کا معاملہ بالعموم یک طرفہ ہوتا ہے اور سکھانے کے ساتھ سیکھنے کے لطف سے بڑی حد تک عاری۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ طلبا کے ذہنی نشو و نما اور ان کے تعلیمی درجات میں ترقی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے نصاب کی طرف ہمارے رویے میں تبدیلی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہمارے نظامِ تعلیم کا ناقص ترین پہلو یہ ہے کہ قصۂ نصاب کی ترتیب کا ہو یا تیاری کا اس کی تمام تر ذمے داری ایسے افراد کے سر ہوتی ہے جو محض جزوی طور پر اس سے عہدہ بر آ ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ نصاب کا انتخاب پہلے سے موجود انتخابات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اسے ترتیب دینے کا کام بیشتر صورتوں میں اساتذہ انجام دیتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر عام طور پر ان کی اپنی ترجیحات، سہولتیں اور تعصبات ہوتے ہیں اور اس عمل میں ان کی رہنمائی کا فرض ان کی اپنی بصیرت نبھاتی ہے۔ بیشتر صورتوں میں یہ بصیرت آزاد نہیں ہوتی۔

سائنسی علوم کی حد تک افراد کی ذاتی بصیرت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میدان میں مطلوبہ حقیقتوں اور مقاصد کی تفہیم یا ترتیب ایک واضح اصول کی تابع ہوتی ہے۔ اس اصول کی اساس چونکہ بدیہی حقایق اور معلومات پر قایم ہوتی ہے اس لیے آسانی کے ساتھ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن انسانی علوم، بالخصوص ادب کے سلسلے میں افراد کی ذاتی نظر، بصیرت اور معیار پر تکیہ کرنا سر[illegible] ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو شخصِ ناتواں اس بارِ گراں کو اٹھانے پر تلا ہوا ہے اُس کے حواس اور اعصاب اور ذہن پہلے ہی سے اس کی ترجیحات اور تعصبات کی نذر ہو چکے ہوں۔ وہ کسی خاص مسلک یا اد[illegible] در غلام ہو۔ اور اس غلامی نے اُس کا حال ایسا کر دیا ہو کہ ادب کی پرپیچ فضا اُسے راس نہ آتی ہو۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ادب کا استاد اپنے مبلغِ علم کی بنیاد پر نصاب کے انتخاب و ترتیب کا کام سنبھالتا ہے۔ اس کے رویے تو اس کی اپنی محدود نظر اور ناقص یا ناکافی معلومات کے واسطے سے متعین ہوتے ہیں۔ وہ دنیا جو اس کے اپنے حواس اور افکار کی گرفت سے آزاد ہے اُس کے نزدیک معدوم ہوتی ہے۔ دور کیوں جائیے، میں نے ادب کے پروفیسروں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ مہندر سنگھ بیدی اردو کے ممتاز افسانہ نگار

ہیں اور محمد حسن عسکری اصل میں تو مورخ ہیں، انھیں بلا وجہ نقاد سمجھ لیا گیا۔

یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ ادب اور شاعری کے نصاب کی ترتیب کا کام ہم خیال افراد کے بجائے افراد کے ایک مختلف الخیال گروہ کو کرنا چاہیے۔ یہ گروہ صرف اساتذہ اور ادیبوں پر مشتمل نہ ہو تو بہتر ہے ورنہ نتیجہ وہی ہوگا جو سامنے ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بیشتر نصابات جو اردو شعر و ادب کے نام پر پڑھائے جاتے ہیں، اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک، وہ بہت ادھورے بہت یک رخے اور ناقص ہیں۔ آپ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصابات کی مدد سے اُن یونیورسٹیوں کا جغرافیہ، پڑھانے والوں کی تاریخ، ان کی اپنی علمی سوجھ بوجھ اور لیاقت، ان کے دین و ایمان یا پسندیدہ میلان کا حال جان سکتے ہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا پیمانہ وجود میں نہیں آیا جس کے ذریعے ادب کی سمجھ اور ذوق کو ناپا جا سکے۔ سائنس اور سماجی علوم میں غلط اطلاعات فراہم کرنے والا آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے۔ ادب، فلسفہ، جمالیات کے میدان میں اس کے برعکس من مانی اور لن ترانی کی خاصی گنجایش ہے۔ اسی واقعے کے پیشِ نظر ایک مغربی عالم نے شعر و ادب کے باب میں مہمل اور متعصبانہ خیالات کی تدریس و ترویج کرنے والوں کو سماجی مجرموں کی صف میں رکھا تھا۔ وہائٹ ہیڈ، پاؤنڈ اور لارنس نے ادب کی تدریس اور ادب کے اساتذہ کا جو منصب مقرر کیا تھا اس کی ادائگی کا حق کتنوں کو پہنچتا ہے، اس سوال کا جواب ڈھونڈا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہمارے یہاں صورتِ حال کس درجہ سنگین ہے۔ بقول شخصے کسی لیبوریٹری میں غلط تھرمامیٹر بنایا جائے تو ہم اُسے بند کروانے کے درپے ہوں گے، لیکن شعر و ادب سے متعلق مسائل کی غلط سے غلط تصویر پیش کرنے والا تمام و کمال آزاد گھومتا پھرے گا۔

یہ معاملہ اس حد تک موضوعی اور ناقابلِ گرفت ہے کہ اردو شعر و ادب کے بیشتر نصابات ادب سے زیادہ تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے ادب کی لازمانیت اور ادبی اقدار کی ابدیت سے انکار نہیں۔ لیکن اس لازمانیت اور ابدیت کے بے سوچے سمجھے اقرار ہی کا یہ عذاب ہے کہ ہم جس دنیا اور جس زمانے میں رہتے ہیں اس کے اپنے تقاضوں کو بڑی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انسانی شعور کے ارتقا اور بصیرت کے سفر سے یکسر بے نیاز ہو کر ادب کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو ہر حقیقت پر ایک واہمے کا گمان ہوتا ہے۔ ماضی کو ماضی کے طور پر بھی جانا جا سکتا ہے لیکن یہ قصہ تاریخ کا ہے

ادب کا نہیں۔ چنانچہ Classics کو پڑھانے کے لیے اپنے عہد کا شعور اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اُس عہد کا جس نے کسی Classic کو جنم دیا۔ ماضی کے ادب کو کسی بامعنی سطح پر اُسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے جب ہم حال کے ادب سے بے بہرہ نہ ہوں۔

ہم ہندوستانیوں کی نفسیاتی مجبوری یہ رہی ہے کہ ہم چند ایک روزمرہ کی برتی ہوئی مادی حقیقتوں کو چھوڑ کر، حیات و کائنات کی کسی بھی سچائی کو قبول کرنے کے اہل اس وقت ہوتے ہیں جب وہ سچائی حال کے دائرے سے نکل کر ماضی کا قصہ بن جائے۔ اردو کے ایک استاد ۵۷ء کے غدر کے بعد سامنے آنے والے جدید وضع کے ہر ادب پارے کو ترقی پسند ادب کا نمونہ قرار دیتے تھے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم طلبا کو صرف گئے زمانوں کی سائنس، سیاسیات معاشیات، فلسفہ پڑھانے پر قانع نہیں ہوتے تو شعر و ادب سے بھلا ایسا کونسا قصور سرزد ہوا ہے کہ اس کے معاملے میں زمانے کی حد مقرر کر دی جائے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے ذہنی تساہل کی سزا اس زمانے کو دے رہے ہیں جس کی ڈور ہمارے ہاتھ سے پھسلتی جا رہی ہے؟ منصب آگاہ معلّم وہی ہے جو زمانے کی رفتار اور ادب کی رفتار کے ناگزیر رشتوں کا گیان رکھتا ہو۔

ثانوی درجات تک ادب کو اگر تاریخ کے طور پر، اور اسی کے ساتھ ساتھ حواس اور جذبات کی تربیت کے ایک بالواسطہ وسیلے کے طور پر پڑھا یا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ہر چند کہ یہاں بھی اس سلسلے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ شاملِ نصاب تخلیقات پڑھنے والوں کی طبیعت اور ان کے تغیر پذیر ماحول اور میلان سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس میں ان تخلیقات کی کوئی افادیت ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر علی گڑھ یونیورسٹی میں اسکول کی سطح پر اردو شعر و ادب کا جو نصاب دس بارہ برس پہلے مروّج تھا اس میں سوداؔ کا یہ شعر بھی شامل تھا کہ ؎

اک برہمن زادہ یہ کہتا تھا کل مل مل کے ہاتھ

مجھ میں اور سوداؔ میں یارو کس قدر یارانہ تھا

یہ بہ ظاہر معصوم سا شعر نوعمر اور کچے ذہن رکھنے والوں کے لیے کس درجہ ہلاکت کا سبب بن سکتا تھا اس کی طرف سب سے پہلے دھیان گیا بھی تو ایک ایسے استاد کا جس نے ہندوستان کی سرزمین پر ابھی قدم رکھا ہی تھا اور اس سے پہلے اپنی عمر کا خاصا بڑا حصہ ایک مغربی یونیورسٹی میں گزارا تھا۔ چودھری

محمد نعیم اُن دنوں امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی سے نئے نئے علی گڈھ آئے تھے۔ گو کہ ان کا سابقہ یونیورسٹی کی سطح کے طلبا سے تھا لیکن انھوں نے اسکول میں مروّج اُس نصاب پر نظر ڈالنا بھی ضروری سمجھا جس سے گزر کر بیشتر طلبا یونیورسٹی کے درجات تک پہنچے تھے۔ اعلا درجات کا نصاب ترتیب دیتے وقت اگر اسکول کی سطح کے نصابات کو ذہن میں نہ رکھا جائے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے بغیر بنیادیں قایم کیے دیواریں اٹھائی جا رہی ہوں۔

اس نوع کی ستم ظریفیوں سے ہمارے نصابات بھرے پڑے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نصاب کا انتخاب کرتے وقت استاد جب مثلاً حصۂ غزلیات پر آتا ہے تو اپنی برسوں کی پرانی عادت اور اپنے تئیں ارادت کے سبب میرؔ، دردؔ، اور سوداؔ کی غزل کے مطلعوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد کاتب کے لیے نشان لگا دیتا ہے۔ بس لیئی اور قینچی کے سپرد اس سے آگے کی خدمت ہوتی ہے۔ نہ یہ خیال کہ میرؔ، دردؔ اور سوداؔ سے اب جن ذہنوں کو روشناس ہونا ہے ان کا فکری، سماجی اور جذباتی ماحول بدل چکا ہے، نہ یہ خیال کہ ہر نصاب علم اور آگہی کی تلاش کا ایک نیا میدان ہوتا ہے جس کے واسطے سے طلبا اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو سمجھنے کا کچھ ہنر سیکھتے ہیں۔ جس طرح صرف لغت سے لُغت ترتیب دینا غلط ہے اُسی طرح محض انتخاب کے سہارے نیا انتخاب تیار کرنا غلط ہے۔ نصاب کی تیاری اُس سفر کی طرح ہے جو کبھی بھی بیچ سے شروع نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ہمیں بار بار خشتِ اوّل کی طرف مڑ کر دیکھنا پڑتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ادب کے نصابات کا رُخ حال سے ماضی کی طرف ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں کوئی انقلاب آفریں اقدام ممکن نہ ہو تو کم سے کم ماضی اور حال کے تناسب کو قائم رکھنا چاہیے تاکہ طالب علم گئے زمانوں کے احساسات اور افکار کو اپنے عہد کے طرزِ فکر اور تجربے سے مربوط کر سکے ایک معینہ حد کو پار کرنے کے بعد طالب علم کو یہ چھوٹ دی جا سکتی ہے کہ اپنے انفرادی ذوق و شوق کی روشنی میں اپنے اختصاص کا میدان منتخب کرے۔ ایم۔ اے کی سطح تک اختصاص کا تصور نامناسب ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں اگر ہماری نظر اور ذہن کے لیے ایک دروازہ کھلے گا تو بہت سے دروازے آپ ہی آپ بند ہو جائیں گے۔

اختصاص ہمارے عہد کا آشوب ہے۔ کچھ تو معلومات اور دریافتوں کے سیلاب کی وجہ سے،

کچھ اس لیے کہ ہم نے نشاۃ ثانیہ کے انسان کی حیثیت بھلادی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم میں اُس جامعیت اور ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کو سہارنے کا حوصلہ نہ ہو۔ اختصاص کے میلان نے ہمارے معاشرے کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچائے ہیں۔ گہرائی وسعت کا بدل نہیں ہوتی۔ پندرھویں صدی کے یورپ کی سمت پلٹ کر دیکھنا مشکل نظر آئے تو کم سے کم ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے عہد میں پنپنے والی شخصیتوں سے ہی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ سرسید، حالیؔ، شبلیؔ، آزادؔ، نذیر احمد کی مثال سامنے ہے۔ ہمارے زمانے کے بہت سے اساتذہ ذہنی اور ادبی رویّے کے اعتبار سے ان بزرگوں کے مقابلے میں پیچھے دکھائی دیں گے۔

پھر بالفرض اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ علم و آگہی کے سیلِ بے پناہ نے ہمارے لیے اختصاص کو ناگزیر بنا دیا ہے، تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ انتخاب کی تیاری کیا کسی اختصاص کی طالب نہیں ہوتی؟ اگر ہم اس اختصاص کے دعویدار ہیں تو ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ نصاب کی ترتیب و انتخاب کے وقت ہم نے درسیات کی کتنی جہتوں کو پیشِ نظر رکھا ہے؟ تاریخ نفسیات، سماجیات، سائنس، جمالیات کی حدیں اسی سطح پر نصاب کی ترتیب و انتخاب کی حدوں سے آملتی ہیں۔

اصل میں ایم۔ اے کی حد تک نصابات کی تشکیل میں قدیم و جدید کا جھگڑا ہی نہیں اٹھنا چاہیے۔ ہمیں نہ تو ماضی کے کسی خاص ادب پارے کو ایک ورقِ پارینہ کے طور پر پڑھانے کا شوق راس آئے گا نہ جدید ادب کو صبح کے اخبار کی صورت دیکھنا راس آئے گا۔ بنیادی مسئلہ اس تسلسل کی شناخت کا ہے جو ہر بڑی ادبی اور تہذیبی روایت فراہم کرتی ہے۔ تسلسل کی اس ڈور میں بندھے ہوئے زمانے ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ یہاں مستثنیات کی نوعیت تجربوں کی ہوتی ہے چنانچہ ان کی بنیاد پر کوئی کلّیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ایسے اصحاب جو اس تسلسل کا ساتھ دینے سے قاصر ہوں انھیں ادب پڑھانے یا ادب کا نصاب ترتیب دینے کی زحمت سے بچنا چاہیے۔

قدیم و جدید کو ایک دوسرے کی ضد تسلیم کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اساتذہ اور طالب علم دونوں اپنے آپ کو کسی ایک سے مشروط کرلیں گے۔ ایسی صورت میں قلب و نظر کی وہ کشادگی جو ادب کے ہر رنگ کو یکساں توجہ سے دیکھنے کے لیے ضروری ہے، جاتی رہے گی۔ جانبداری کو ہیں زندگی کے بیشتر

معاملات میں ایک صحت مند زاویے کے طور پر دیکھتا ہوں لیکن معلم اور متعلم کے یہاں یہی زاویہ اکثر ایک بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس زاویے سے ادبی روایت اور اس کا تسلسل بھی ویسا کچھ نظر نہیں آتا جیسا کہ واقعتاً ہے بلکہ ہم اسے اُسی شکل میں دیکھتے ہیں جیسا کہ دیکھنا چاہتے ہیں یا دیکھ سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زندگی اور اس کے مظاہر پچھلی چند دہائیوں میں غیر معمولی تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔ زمانے کی رفتار بڑھی ہے۔ حسن اور بدصورتی کے تصورات تبدیل ہوئے ہیں۔ فن اور جمالیات کی طرف ہمارا رویہ تبدیل ہوا ہے لیکن یہ تبدیلی اگر اپنے حدود میں رہے اور ہم سے تجزیے اور معروضی مطالعے کی صلاحیت کا سودا نہ کرے تو شعر و ادب کے مختلف النوع مظاہر کو ایک سی دلچسپی کے ساتھ پڑھنا اور سمجھنا محال نہیں۔ ترجیحات لازمی طور پر تعصبات کی پابند نہیں ہوتیں۔

تجربے ذاتی ہوں یا اجتماعی، زمانے کے ساتھ ان کی پیچیدگی میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔ فطرت کے اس قانون کو جھٹلانے کا مطلب ہے ارتقا کے رموز سے بے خبری۔ اس نوع کی بے خبری علوم و ادبیات، دونوں کے مطالعے میں ادراک و افہام کے کئی دروازے ہم پر بند کر دیتی ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اردو نصابوں میں جدید ادیبوں اور شاعروں کی نمائندگی اور شمولیت اساتذہ اور طلبا سے جس ذوق اور آگہی کا تقاضہ کرتی ہے، اس کی ماہیت کیا ہے تو یہ ایک الگ سوال ہے اور ایک الگ تفصیل کا طالب۔ خاتمۂ کلام کے طور پر میں صرف اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ گئے زمانوں میں جس طرح ادب کے استاد اور طالب علم پر بعض پرانے علوم سے شناسائی کی شرط لازم آتی تھی، اسی طرح نئے ادب کی اپنی شرطیں ہیں۔ نئے افکار اور علوم کی ایک تیزی سے بنتی ہوئی دنیا ہے، نئی تہذیبی اور جمالیاتی قدریں ہیں اور ایک نئی سماجی صورت حال کا جبر۔ ان حقیقتوں سے آنکھیں چار کیے بغیر درس و تدریس کا عمل ادھورا ہی نہیں رہے گا بلکہ ہم وقت کے نئے دائرے میں اپنی ہستی کے مفہوم اور اپنی انسانیت کا دفاع کرنے میں بھی ناکام رہیں گے۔

محمد قاسم صدیقی

معاشرتی نصاب کا تنقیدی تجزیہ

نصاب ایک ایسا وسیع اور واضح تعلیمی لائحۂ عمل یا منصوبہ ہے جس کے تحت اساتذہ طلبہ کو تربیت دیتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر وہ اور تعلیمی ادارے اپنی ذمہ داریاں اور فرائض پورے کرتے ہیں۔ نصاب ایک تعلیمی عمل کا ضابطہ یا پروگرام ہے جس کے مقرر کردہ اندراج و اصول کے تحت تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصاب تعلیمی اداروں کے داخلی و خارجی تقاضوں کی آسودگی کا ایک معاون ذریعہ یا آلہ ہے جس کے ذریعے فرد ذہنی جذباتی معاشرتی اور معاشی مطابقت حاصل کرتا ہے۔

بقائے انسانی کا دارومدار علم حرفت سے کہیں زیادہ انسانی تعلقات کی ترقی پر ہے۔ آج کے ہندوستان میں زندگی اور سماج میں بہ تسلسل عدیم النظیر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں رسل و رسائل اور آمد و رفت کی تیز رفتار ترقی سے لوگ ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے ہیں اور مختلف النوع سرگرمیوں کے سلسلے میں اس تیزی سے حرکت کر رہے ہیں کہ خود ان میں ہی سے بہت سے محسوس کرتے ہیں کہ یہ زندگی ایک دوڑ ہے یعنی بے شمار تبدیلیاں موجودہ معاشرے کی خصوصیت میں سے ہو گئی ہیں۔ معاشرے میں جلد جلد بڑھتی ہوئی پیچیدہ اور دقیق تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی معاشرتی بدنظمی نے آج ماہرین تعلیم کے سامنے بہت سے سوال کھڑے کر دیے ہیں۔

اس پیچیدہ دنیا میں معاشرتی علوم پر ہی بچوں کو زندگی گذارنے کے طریقے سکھانے کی ذمہ داری ہے۔ مدرسے کے نصاب کے تمام شعبوں کے کچھ نہ کچھ معاشرتی مقاصد ہوتے ہیں۔ معاشرتی علوم اس

لحاظ سے بے مثل ہیں کہ اس کے نفسِ مضمون اور مقاصد کا تعلق انسانوں سے ہوتا ہے یعنی معاشرتی علوم کا واسطہ افراد کے مابین تعلقات خاص کر گروہوں کے مابین تعلقات سے ہوتا ہے۔

معاشرتی علوم ابتدائی اور ثانوی مدارس کے عام تعلیمی منصوبوں کے ایک بنیادی شعبے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں تاریخ جغرافیہ اور علم حدیث خاص ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاشرتی علوم کی تدریس کے کیا مقاصد ہیں۔ کسی مضمون کے پڑھانے کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ قومی، ملکی اور تعلیمی مقاصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اگر ہم تعلیم کا اہم مقصد موثر شہری بنانا قبول کریں تو معاشرتی علوم سب سے پہلے آئیں گے دراصل تعلیم کے مقاصد اور معاشرتی علوم کی تدریس کے مقاصد کو الگ کرنا بہت دشوار ہے۔ تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہے جو مکمل شخصیت رکھتے ہوں جس کی وجہ سے وہ ذی ہوش دانش مند بنیں وہ فہم و ادراک اور موجودہ حالات و حقیقت جاننے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔ طلبہ کے ان اوصاف کی ترقی ہو جن کو معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

معاشرتی علوم کی تدریس کا پہلا مقصد یہی ہے کہ ان باتوں کی ماہیت کا فہم، جیسے معاشرتی ماحول کے بڑے بڑے پہلو اور وہ طریقے جن کے ذریعے لوگ اپنے ماحول سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ افراد، گروہ اور معاشرے میں بنیادی رشتہ و تعلق۔ تہذیبی ترقی کی بنیادی خصوصیات اور عناصر، اسی کے ساتھ ایسے رجحانات کی ترویج جیسے افراد کا احترام کرنا جمہوریت اور اس کے عوامل، شہریت کی ذمہ داریاں، قانون اور اس کی پابندی کے اصول۔ حکومت خود اختیاری کے اصول پر یقین۔ تصور وقت کی نشو و نما۔ معاشرتی وراثت۔ ممالک اور ان کے باشندوں کے رہن سہن سے واقفیت وغیرہ۔ دنیا کے متعلق مفید علم اور معلومات حاصل کرنا۔ طلبا میں پسندیدہ اوصاف اور صلاحیتیں پیدا کرنا گویا معاشرتی علوم کا اہم مقصد طلبا کو ان کے ملک اور ان کی دنیا کے جغرافیائی تاریخی اور مجلسی پس منظر کا موثر فہم عطا کرنا اور ان کے دل میں اپنے فرائض اور حقوق کا زندہ احساس پیدا کرنا اور انھیں مختلف ذمہ داریاں ادا کرنے کی عملی تربیت دینا ہے! اس اہم مقصد سے بہت سے ذیلی مقاصد تشکیل پاتے ہیں مثلاً معاشی سیاسی اور مجلسی مسائل کو سمجھنے اور ان کا جائزہ لینے کی صلاحیت پیدا کرنا یا مجلسی ذمہ داریوں

فرائض اور حقوق کا احساس پیدا کرنا۔ فرد کو ایک مفید اور وفادار شہری کے طور پر سوچنے، محسوس کرنے اور عمل پیرا ہونے کے قابل بنانا۔ ثقافتی اور قومی میراث کا حسن واضح کر کے وطن کی محبت اور زندگی کی مستند اقدار کا احترام پیدا کرنا۔ ماحول کی روز افزوں واقفیت، مشاہیر عالم کے کارناموں سے واقفیت۔ طبی ماحول اور انسانی سرگرمیوں کے باہمی تعلق کا ابتدائی علم۔

ان مقاصد کے بعد ہی ہم دہلی کے اسکولوں میں معاشرتی علوم کے نصاب کو پرکھ سکتے ہیں۔ ان علوم میں تاریخ، علم مدنیت اور جغرافیہ کا الگ الگ ہی جائزہ لینا مناسب ہے اس لیے کہ گو یہ معاشرتی علوم کہلاتے ہیں کہ وسطانیہ درجات تک ہسٹری اور سوکس ایک ہیں اور جغرافیہ الگ اور ثانوی درجات میں یہ تینوں مضامین سوشل اسٹڈیز کے نام سے پکارے جاتے ہیں لیکن عملی طور پر یہ سب الگ الگ ہیں اور غالباً مختلف اداروں میں تاریخ کے اور جغرافیہ کے اساتذہ بھی الگ الگ ہیں۔

ان تینوں مضامین کے نصاب کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ نصاب کی تدوین پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے تاکہ پھر اصول، مقاصد اور متن تینوں کو سامنے رکھ کر نصاب کو دیکھا جائے کہ وہ ان تمام ضرورتوں پر پورا اتر رہا ہے یا اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے

نے نصاب کی تعریف اس طرح کی ہے:

"نصاب، بچّوں کے تجربات سے عبارت ہے اور یہ ایک ایسا تحریری تعلیمی منصوبہ ہے جو اسکول کے بچّوں کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔"

البرٹ کا کہنا ہے کہ نصاب اسکول کی داخلی وخارجی سرگرمیوں کا مجموعہ ہے جو بچّوں کے نفسیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ اور معاشرتی قدروں سے مربوط ہے۔ نصاب آموزش کی سرگرمیوں اور مواقع کا ایک سلسلہ ہے جو اساتذہ اور طلبا کے باہمی اشتراک سے بنتا اور تکمیل پاتا ہے نصاب کے جدید تصور میں نصاب کی بنیاد اس نظریے پر قائم ہے کہ انسان کا ذہن یا دماغ ایک بسیط وحدت کا حامل ہے جس کی تمام قوتیں انسانی جبلات اور فرد و ماحول کے باہمی اشتراک عمل سے نشو و نما پاتی ہیں۔ یہ دماغی قوتیں اور صلاحیتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لیے نصاب میں جو چیزیں شامل کی جائیں وہ بچّے کے نفسیاتی تقاضوں سے ہم آہنگ

ہوں اور معاشرتی قدروں سے مربوط ہوں۔

جان ڈیوی نے صحیح کہا ہے:

"اگر اسکول کا نصاب بچے کے تقاضے معاشرتی اقدار اور آزادیٔ عمل کا حامل ہے تو وہ بہتر ہے ایسے نصاب سے بہتر شخصیت بہتر معاشرے کی تخلیق ہوگی! ایسے نصاب میں معاشرتی قدروں کو لازمی سمجھا جاتا ہے اور بچے کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔"

تاریخ۔ تاریخ کا موضوع ہے انسان اور اس کا ارتقا ابتدائے عالم سے آج تک۔ اس لیے تاریخ کے معنی نہ صرف قوم کی گذشتہ زندگی کی تفصیلات ہونی چاہئیں بلکہ اس کے جملہ علوم و فنون کی تربیت اور اس کے تمام کارناموں کی سرگذشت۔ اگر تاریخ کے نصاب پر ایک نظر ڈالی جائے تو درجہ اول سے درجہ دہم تک کا نصاب ایک کڑی اور وحدت کا پتہ تو دیتا ہے مگر ابتدائی درجات میں آج کی ضرورتوں کو شامل کرنا ضروری ہے۔ ملک میں جمہوری سوشلزم، ایک نعرہ نہ بنے بلکہ وہ ایک ضرورت بن جائے۔ قومی یک جہتی آج کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں ہو سکتا کہ نئی نسل کو اگر قومی یک جہتی کی طرف عملی طور پر متوجہ کرنا ہے تو ہمیں تاریخ کو نئے طور سے پڑھانا ضروری ہے، یہ صحیح ہے کہ N C E R. T. نے نئی تاریخ کی کتابوں اور نئے نصاب پر محنت کی ہے لیکن آزادی کی تاریخ اور آزادی کے لیے قربانی دینے والوں کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔ دہلی کی شخصیات آصف علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، گپتا ان کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔ تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرنے کے بجائے اور لڑائیوں کی داستان سنانے کے بجائے ان سنہرے کارناموں کی طرف بھی توجہ دلانے کی ضرورت ہے جو انسانوں کو توڑنے کے بجائے جوڑتے رہے ہیں۔

ابتدائی جماعتوں میں اگر قومی لیڈروں کی کہانیاں ہوں تو وہ زیادہ بہتر ہوگا۔ طالب علم کی توجہ کو کسی بڑی شخصیت یا تحریک یا نصب العین پر لگایا جائے تاکہ تاریخ کا مطالعہ ہمارے طالب علموں میں محبت حلم اور مفاہمت پیدا کرے اور وہ مادرِ وطن کے وفادار کارکن اور مفید شہری بن سکیں۔

ثانوی درجات میں تاریخ کا نصاب طلبا کی استعداد سے زیادہ ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ

ایک معلم کس طرح تھوڑے سے وقفے میں اس نصاب کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔

نصاب کی تدوین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں وہ لچکدار ہو، ربط و تسلسل ہو، اس میں وسعت ہو حرکی اور زندگی سے مربوط ہو، اخلاقی اقدار کا حامل ہو وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ متوازن Balanced ہو۔ نہم اور دہم کا تاریخ کا نصاب اس پر پورا نہیں اترتا۔ اس میں تبدیلی کی سخت ضرورت ہے۔ تاریخ کے مطالعے کی پُر امکانی افادیت تاریخی عمل کے شعور کی نشو و نما ہوتی ہے طلبہ کے لیے بلاواسطہ اور بالواسطہ ذریعوں کا فرق معلوم کرنا معلومات کے مختلف ذریعوں کی نسبتی قدروں کا جائزہ لینا اور معلومات سے صحیح نتیجہ نکالنے کا طریقہ سیکھنا ضروری ہے۔ یہ نصاب تاریخ کے سلسلے میں ان پر زور دینے کی شہادت پیش نہیں کرتا۔

<u>علم مدنیت</u>: عزم، تازگی، جرأت، جوش، حوصلہ وغیرہ صفات کے اعتبار سے صرف طالب علم کی ہستی ہے جو سوسائٹی کی تعمیر و تخریب اور شکست و ریخت کی ابتدا ہی سے قابلیت رکھتی ہے اور مستقل آغاز وسط اور انجام کو مد نظر رکھ کر حرکت کرتی اور سلسلۂ عمل کی بنیاد ڈالتی ہے سوسائٹی کا فرد یا اکائی ہونے کے لحاظ سے طالب علم ہی سماج کا بنیادی پتھر ہے جس پر آئندہ سماج کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اس کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے اس کا مکمل خاکہ عملی پہلو سے علم شہریت یا علم مدنیت کہلاتا ہے۔

سوکس پڑھانے کے اغراض و مقاصد کا تعلق براہِ راست فلسفۂ حیات کے ساتھ ہے اس کا کام نئی پود کو قومی روایات کی روح سے باخبر کرنا ہے۔ ضروری اور غیر ضروری میں تمیز، مختلف اسباب کی اہمیت کا اندازہ، سچ کو جھوٹ سے الگ کرنا، اغلب اور غیر ممکن کے درمیان فرق کرنا، یہ بلند ذہنی اوصاف ہیں جن کے پیدا کرنے میں علم مدنیت سب سے زیادہ حصہ لے سکتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ طلبا پیار و محبت رحم و ہمدردی، دوستی و رفاقت جیسے اہمیت کے حامل اعلا جذبات کو زندگی میں اپنائیں اور قومی تنگ نظری، فرقہ پرستی، بد نظمی وغیرہ سے اوپر اٹھ کر پورے عالم کو ایک خاندان کی صورت میں دیکھیں۔ قومی کردار کے بنانے کی یہ واحد کنجی ہے۔

ہمارے نصاب میں جن چیزوں پر زور دیا جانا چاہیے ان میں سے کچھ منفی چیزیں ہیں

جن کو اجاگر کرنا اور اُن کے نقصانات کی نشاندہی کرنا ہے۔ قومی عصبیت، فرقہ پرستی، لسانی جھگڑے صوبہ پرستی، توہم پرستی، علاقائیت وغیرہ کے نقصانات بتانا اور اتحاد، جمہوریت، عالمی برادری بھائی چارہ سائنسی نقطۂ نظر کی اہمیت واضح کرنا چاہیے۔

اس نصاب کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ عملی نہیں اکتسابی ہے۔ داخلی نہیں خارجی ہے۔ قانون اور اس کی تاریخ بتانا ہی ضروری نہیں، بلکہ اس کے اثرات کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ حقوق و فرائض پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔ شہریت کی صحیح تعریف اور اس کی ذمہ داریوں کی وسعت پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اچھی شہریت کے بہت سے امتیازی اوصاف دوسروں کے قدم بقدم چلنے کی کوشش سے پیدا کیے جا سکتے ہیں لیکن موثر وہ ہوتے ہیں جنھیں بچے خود موثر سمجھ کر قبول کریں۔ اس کی تربیت میں طلبا کی قائدانہ صلاحیتوں کو ترقی دینا بھی شامل ہے طلبہ کے ذہنوں میں جمہوری خیالات اور رجحانات اور فہم پیدا ہو اس کی ضرورت ہے۔

جغرافیہ : بیسویں صدی میں جغرافیہ سے متعلق جو نیا رجحان ثانوی مدارس کے موضوعات، تعلیم میں بالواسطہ وسیع پیمانے پر پایا جاتا ہے اس کی نوعیت انسانی اور تمدنی ہے اس لیے اب انسان اور اس کے قدرتی ماحول کے مابین جو رشتے ہیں ان پر محض ماحول کے مطالعے سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔ آج تو قدرتی اور انسانی جغرافیہ کو علاقائی مطالعے میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ قدرتی ذرائع کے دانشمندانہ استعمال پر زور دیا جائے۔ پروفیسر کے خیال میں جغرافیہ کا اہم کام یہ ہے کہ وہ آئندہ بننے والے شہریوں کی اس طرح تربیت کرے کہ وہ دنیا کے حالات سمجھ سکیں اور اس کے سماجی اور سیاسی مسائل کے بارے میں خردمندانہ طور پر سوچ بچار کر سکیں۔

پروفیسر اسکارف نے انسانوں پر زور دیا ہے۔ ان کے مطابق جغرافیہ کے ذریعے بچوں میں ایک ایسا ذہنی رجحان پیدا کرنا چاہیے جس کی مدد سے وہ ان باتوں کو سمجھ سکیں جو دنیا کے رہنے والوں کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو محسوس کر سکیں جو ایک دوسرے پر منحصر دنیا ان پر عائد کرتی ہے۔

ثانوی سطح پر جغرافیہ کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ طبعی اور دوسرا حصہ جنرل جغرافیہ

(اقتصادی، انسانی اور سیاسی)

پہلے حصے میں زمین کے بارے میں خاص خاص باتیں شکل، سائز، زمین کی وسعت، رات اور دن، موسم، شمسی نظام، سطح زمین، کرۂ آب۔

دوسرا حصہ دنیا کے بڑے قدرتی حصے۔ (آب و ہوا، زراعت، صنعت، درآمد، برآمد ذرائع آمدورفت۔

ایشیا

یورپ، روس

شمالی امریکہ، قدرتی وسائل اور صنعتی ترقی

جنوبی امریکہ

افریقہ

آسٹریلیا بلحاظ طبعی حالت، انسانی زندگی، ذرائع آمدورفت۔

مندرجہ بالا عنوانات میں اگر قدرتی وسائل اور صنعتی ترقی کو ہی اہمیت دی جاتی اور ان ہی کے تحت دوسرے ممالک کا بھی جائزہ لیا جاتا تو بہتر تھا۔

اس نصاب کو ایک نظر دیکھ کر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہ تو زندگی کے مختلف معاملات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور نہ قومی شعور کی نظریاتی اساس سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم موجودہ ضرورتوں کو مد نظر رکھیں۔ نئی روشنی کو جگہ دیں اور سائنسی نقطۂ نظر کو پیش رو سمجھیں اور نصاب کی تدوین نئے طور پر کریں۔

سید امان الرحمن

اردو میں نصابی کتابوں کی طباعت کے مسائل

نصابی کتابیں ہوں یا غیر نصابی، ان کی طباعت کے مراحل اور مسائل تقریباً یکساں ہی ہوتے ہیں، البتہ نصابی کتابوں کی طباعت و اشاعت کے معاملے میں وقت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ضروری ہوتا ہے کہ جب تعلیمی سال شروع ہو تو طلبا کو ان کے نصاب کی کتابیں آسانی سے ملیں۔ یوں تو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام سارے سال ہی چلتا رہتا ہے لیکن نصابی کتابوں کی اشاعت اور فراہمی کے سلسلے میں ناشرین اور کتب فروش مارچ سے جولائی تک خاص طور سے بے حد مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عموماً مارچ اپریل میں سالانہ امتحانات ہوتے ہیں اور مئی سے نیا ایڈمیشن شروع ہوتا ہے لیکن اس میں باقاعدگی موسم گرما کی طویل تعطیل کے بعد ہی آتی ہے یعنی جب دوبارہ اسکول کھلتے ہیں اور اس باقاعدگی کا سلسلہ عموماً جولائی کے پہلے ہفتے سے شروع ہوجاتا ہے۔

جو نصابی کتابیں مل سکتی ہیں، طلبا انھیں عموماً نئے درجے میں پہنچنے کے بعد فوراً ہی خریدنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر وہ سب اس وقت فراہم نہیں ہو پاتیں تو پھر جولائی میں دوبارہ اسکول کھلنے پر ان کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جو نصابی کتابیں پرائیویٹ پبلشر شائع کرتے ہیں وہ تو کسی نہ کسی طرح جولائی تک مارکیٹ میں آ ہی جاتی ہیں لیکن سرکاری اداروں سے شائع ہونے والی اردو کی نصابی کتابوں کا وقت پر مہیا ہونا مشکل ہی ہوتا ہے۔

نصابی کتابوں کی طباعت کے مسائل پرائیویٹ پبلشرز کے لیے بھی وہی ہیں جن کا سامنا

سرکاری اداروں کو بھی کرنا پڑتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ پرائیویٹ پبلشرز ان کو قدرے آسانی سے ذاتی حیثیت میں حل کرلیتے ہیں جب کہ سرکاری اداروں میں اپروول اور سینکشن کے چکر میں کچھ زیادہ ہی وقت لگتا ہے۔

کتابوں کے سلسلے میں سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ کتابت کا ہوتا ہے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ برسہابرس گزرنے کے بعد بھی اردو طباعت میں ٹائپوگرافی مقبول نہیں ہوسکی ہے۔ کتابت ایک فن ہے اور یقیناً اس فن کی اپنی انفرادیت ہے لیکن اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ کتاب کی تخلیق کے بعد سب سے زیادہ وقت اس کی کتابت میں لگتا ہے۔ قلم کی یکسانیت برقرار رکھنے کے لیے یہی کوشش کی جاتی ہے کہ ایک ہی کاتب پوری کتاب کی کتابت کرے۔ تیز سے تیز لکھنے والا کاتب بھی میرے خیال میں ایک دن میں چھ صفحوں سے زیادہ کتابت نہیں کرتا۔ کتابت بلاشبہ سخت محنت کا کام ہے، پتّامار کر اس فن کا ریاض حاصل کیا جاتا ہے اور اچھا کاتب وہی ہوتا ہے جسے اپنے ہاتھ اور قلم پر قدرت ہو، دائرے، قوسیں، نوکیں یکساں رہیں۔ ایسا نہیں کہ کہیں الف لمبی ہے تو کہیں مختصر۔ کہیں ن کا دائرہ بڑھ گیا ہے تو کہیں ب میں کشش زیادہ آگئی۔ خیر، یہ باتیں تو بعد کی ہیں اور ویسے بھی آج کل ان نکات کی طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی جاتی ہے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ کاتب جلد سے جلد کتابت کردے تاکہ کتاب چھاپ کر فراہم کی جاسکے۔ اس سلسلے میں کہیں کہیں قلم کی یکسانیت کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا اور وقت بچانے کے لیے یا یوں کہیے کہ وقت پر نصابی کتابیں فراہم کرنے کے لیے ایک کتاب کو کئی کاتبوں سے لکھوا لیا جاتا ہے تاکہ جلد سے جلد کتابت مکمل ہوجائے بھلے ہی ہر کاتب کا قلم اور انداز اپنی جگہ نمایاں ہو۔ ایک کاتب نے تیز روشنائی استعمال کی ہو، دوسرے نے ہلکی تیسرے نے کھلی کھلی کتابت کی ہو جبکہ چوتھے کی کتابت گنجی ہوئی ہو، ظاہر ہے یہ انداز طباعتی خوبیاں ختم کردیتے ہیں۔ البتہ کتاب قدرے جلدی شائع کی جاسکتی ہے۔ لیتھو سے جو کتابیں شائع کی جاتی ہیں، ان کی کتابت سیم سائز پر ہوتی ہے، اس لیے ان میں خطوں کا فرق آسانی سے سامنے آجاتا ہے جبکہ آفسٹ میں سوائے یا ڈیوڑھے پر کتابت کراکر اسے Reduce کرالیا جاتا ہے تو ایک کتاب میں کتابت کے مختلف خطوں میں بھی یکسانیت سی آجاتی ہے۔ اور اس طریقۂ طباعت سے کتابت کے بہت سے عیب بھی چھپ جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لیتھوگرافی یقیناً ایک کارآمد اور سستا طریقۂ طباعت رہا ہے۔ لیکن آج جب جدید فن طباعت کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے صرف مہنگائی کے خیال سے اردو کو لیتھو تک محدود رکھنا زبان کو نئی زندگی سے بچانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لیتھو سے چھپی ہوئی کتاب کی قیمت کسی دوسرے طریقۂ طباعت سے چھپی ہوئی کتاب کی قیمت سے کم ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ لیتھو میں ہمیں جدید فن طباعت کی خوبیاں نہیں مل سکتیں۔ آفسٹ یقیناً مہنگا طریقہ ہے اور اردو کی نصابی کتابوں کی عموماً اور جنرل کتابوں کی خصوصاً تعداد اشاعت کم ہوتی ہے اس لیے لامحالہ اس طریقۂ طباعت کی وجہ سے اردو کی کتابیں خاص طور سے مہنگی ہو جاتی ہیں لیکن آفسٹ کی طباعتی خوبیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ نصابی کتابیں اسی طریقے سے چھاپی جائیں تاکہ طلبا کو طباعتی خوبیوں سے مزین کتابوں کے مطالعے کا موقعہ ملے۔ کتاب اچھی چھپی ہو تو اس کے پڑھنے میں بھی دل لگتا ہے اور اسے محفوظ رکھنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ کتابت کے سلسلے میں، میں ایک بات اور کہنی چاہوں گا، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس میں وقت زیادہ لگتا ہے اس لیے اگر اردو ٹائپ کو اپنانے کی طرف توجہ دی جائے تو نہ صرف وقت کی بچت ہوگی بلکہ کتابت کے مقابلے میں لاگت بھی کم آئے گی۔ اور یہ تجربہ میرے خیال میں نصابی کتابوں سے ہی شروع کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ طلبا انگریزی ٹائپ اور ہندی ٹائپ میں چھپی ہوئی کتابیں پڑھ سکتے ہیں تو اردو ٹائپ میں شائع کردہ کتابیں بھی انھیں اجنبی نہ معلوم ہوں گی۔ جب نصابی کتابیں ٹائپ میں شائع ہونے لگیں گی تو دوسری کتابوں کے لیے بھی اردو ٹائپوگرافی کو اپنایا جا سکے گا۔ ۲۰۰ صفحے کی ایک کتاب کی کتابت میں ایک کاتب کم سے کم ڈیڑھ مہینہ لیتا ہے اس کے بعد پروف ریڈنگ اور تصحیح کے مرحلے میں مزید ایک مہینہ اور لگ سکتا ہے۔ جب کہ ۲۰۰ صفحے کی یہ کتاب زیادہ سے زیادہ دو تین دن میں کمپوز کی جا سکتی ہے اور فوٹو کمپوزنگ سے یہ کام صرف ایک دن کا ہے۔ اس کے بعد ایک ہفتہ پروف ریڈنگ اور تصحیح کے لیے رکھ لیجیے اور اگلا ہفتہ کاغذ کی فراہمی اور طباعت و اشاعت کے مراحل سے لے کر کتاب کی بائنڈنگ اور ریلیز تک لگ سکتا ہے۔ اس طرح پندرہ بیس دن میں ہمیں ایک کتاب آسانی سے تیار مل سکتی ہے اور اگر نئی کمپوزنگ نہ کرانی ہو تو وہی پرنٹ ایک دو دن میں ہی شائع کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کتابت کے اسکول کھولنے اور طرح طرح کتابت کے

اسٹائل دریافت کرنے سے بہتر ہے کہ اردو ٹائپوگرافی پر توجہ دی جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کتابت کو بالکل نظرانداز کردیا جائے، بلاشبہ اس فن کو محفوظ رکھنا بہت ضروری ہے لیکن اس کے معیاروں کے ساتھ۔ آج کتنے کاتب ہیں جنھیں فن کتابت میں ماہر کہا جاسکتا ہے، جو اس کو فن کی طرح برتتے ہیں؟ آج کل کتابت سیکھنے کا شاید اسی لیے زور ہے کہ کام تو مل ہی جاتا ہے، کیسا بھی لکھیں دام پورے ملیں گے کیونکہ ٹائپ میں کتابیں مقبول نہیں ہیں۔ اسی لیے میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فن کے طور پر اسے نہیں سیکھا جارہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتابت کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر وقت کی بچت کا معاملہ ہی نظر میں رکھا جائے تو بھی نصابی کتابوں کے لیے خاص طور سے اردو ٹائپوگرافی پر توجہ کی ضرورت ہے، بطور تجربہ ہی سہی۔ یہ سچ ہے کہ ہر تجربے کو روایت بننے میں دیر لگتی ہے لیکن تجربات نے ہی زندگی کو آگے بڑھایا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی ہے، ٹائپ میں معیار مقرر ہیں ۱۰ پوائنٹ بارہ پوائنٹ وغیرہم جبکہ کتابت میں جلی، خفی، باریک وغیرہ جیسی اصطلاحوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ٹائپ کمپوز صفحے میں عموماً ساڑھے تین سو الفاظ آتے ہیں جبکہ کتابت کے سلسلے میں ہمیں کاتب کے انداز اور قلم پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ٹائپ میں جو کتاب سو صفحات میں آجائے گی وہ کتابت کے ڈیڑھ سو بلکہ اگر کاتب چاہے تو اسے دو سو صفحات میں پھیلا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس سے ہر قدم پر لاگت بڑھے گی اور لامحالہ کتاب کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔ سو صفحے کی نصابی کتاب اگر تین روپے میں مل سکتی ہے تو ۲۰۰ صفحے کی ہوجانے پر چھ روپے کی ہوجائے گی جبکہ مواد اور متن یکساں ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نصابی کتابوں کی طباعت سلسلے میں یہ مسئلہ خصوصی توجہ چاہتا ہے کیونکہ نصابی کتابوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں شائع ہوں تاکہ تعلیمی سال شروع ہونے پر طلبا کو آسانی سے مل سکیں اور ان کا وقت کتاب یا کتابوں کے انتظار میں ضائع نہ ہو۔

کتابت اور پروف ریڈنگ کے مرحلے سے نکل کر جب کتاب طباعت کے لیے پریس بھیجی جاتی ہے تو وہاں بھی کچھ مسئلے سامنے آتے ہیں۔ لیتھو سے چھپنے والی کتاب ہے تو اس میں آج کل زیادہ وقت لگتا ہے کیونکہ اس طریقۂ طباعت کے پریس اب دو تین ہی رہ گئے ہیں، ظاہر ہے ان کے ہاں کام کا رش رہتا ہے۔ مشینیں پرانی ہیں، ان کی وجہ سے بھی دیر لگتی ہے، سنگ سازی کا رواج تقریباً

ختم ہی ہے اس لیے جیسی بھی پلیٹ جم جاتی ہے ویسی ہی کتاب چھپ جاتی ہے، اچھے برے کسی بھی معیار کے بغیر۔ یوں کہیے کہ کتاب چھپ تو گئی۔ دوسری طرف طریقۂ آفسٹ کے بھی کچھ اپنے مسئلے ہوتے ہیں۔ نیگیٹو کا بننا، فرض کیجیے مارکیٹ میں فلم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نیگیٹو ایک دن میں بن جانے چاہییے تھے انھیں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ آفسٹ پریس خالی رہتے ہیں، وہاں بھی کام کا رش رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی آفسٹ کی جو تیز رفتاری ہے وہ بہت وقت بچاتی ہے۔ کتاب لیتھو طریقۂ طباعت کے مقابلے میں بہت پہلے اور طباعتی خوبیوں کے ساتھ شائع کی جا سکتی ہے۔ جو سرکاری ادارے اردو کی نصابی کتابیں چھاپتے ہیں، وہ محدود تعداد اشاعت کے باوجود اسی طریقۂ طباعت کو اپناتے ہیں تاکہ صاف ستھرا نصاب طلبا کو مہیا ہو سکے۔

دنیا بھر میں کاغذ کی کمی ہے۔ ظاہر ہے اس کمی سے ہمارا ملک بھی متاثر ہے۔ لیکن کاغذ کی کمی کی وجہ سے نصابی کتابوں کی اشاعت تو نہیں روکی جا سکتی البتہ کاغذ کی فراہمی میں تاخیر کی وجہ سے کتاب کی اشاعت میں ضرور دیر ہو جاتی ہے اور پھر اس سے متاثر طلبا ہی ہوتے ہیں۔ کاغذ مہنگا بھی بہت ہو گیا ہے لیکن حکومت نصابی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بڑی مدد کرتی ہے اور سبسی ڈائزڈ قیمت پر نصابی کتابوں کے لیے کاغذ فراہم کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتی اسی لیے سرکاری اداروں کی شائع کردہ نصابی کتابیں سستی بھی ہوتی ہیں اور زیادہ طباعتی خوبیوں سے مزین بھی — لیکن اس کے باوجود اردو میں نصابی کتابوں کا نہ تو کوئی طباعتی معیار قائم ہو سکا ہے نہ ہی وقت پر ان کی فراہمی ہو پاتی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے سری نگر میں اردو طباعت و اشاعت کے مسائل پر ہونے والے ایک سیمینار میں تقریباً آٹھ سال پہلے کہا تھا: "آزادی کے بعد سے لے کر اب تک اردو کی نصابی کتابوں کا مسئلہ بڑا تشویشناک رہا ہے۔ تقریباً تمام صوبے اپنی علاقائی زبانوں میں نصاب کی کتابیں چھاپ رہے ہیں لیکن جموں کشمیر، بہار، مہاراشٹر اور دہلی کو چھوڑ کر کوئی بھی صوبائی حکومت اردو کی نصابی کتابیں چھاپنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اتر پردیش تک میں نصاب کی بیشتر اردو کتابیں فراہم نہیں ہوتی ہیں اور جو فراہم ہوتی ہیں وہ طالب علموں تک ستمبر یا اکتوبر تک بھی پہنچ جائیں تو غنیمت سمجھیے۔ دہلی میں یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا ہے لیکن ایک دو کتابوں کے بارے میں ہر سال شکایت رہتی ہے۔ نصابی کتابوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اردو طالب علموں کی

تعداد کم ہوتی ہے اس لیے کتابیں کم تعداد میں چھاپی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے اور کم تعداد اشاعت کی وجہ سے پرائیویٹ پبلشر کتابیں چھاپنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔"

یقین کیجیے آج آٹھ سال بعد بھی اردو میں نصابی کتابوں کی صورتِ حال تقریباً یہی ہے — سرکاری ادارے ہی اردو کی جو نصابی کتابیں شائع کر دیتے ہیں وہی طلبا کو مل پاتی ہیں۔ ان اداروں سے چھپنے والی کتابوں کی اشاعت میں اکثر و بیشتر تاخیر ہو جاتی ہے۔ وجہ فائلوں کی مومنٹ، کہیں کتابت کا مسئلہ ہے تو کبھی کاغذ کی خریداری کے لیے وقت پر سینکشن نہیں مل پاتی اور جب سینکشن ملتی ہے تو مارکیٹ میں مطلوبہ وزن اور سائز کا کاغذ دستیاب نہیں ہوتا۔ اس انتظار میں بھی تاخیر ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کسی نہ کسی وجہ سے پریس میں دیر ہو جاتی ہے اور پریس میں دیر عموماً اردو کتابوں کی تعداد اشاعت کم ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ پریس والا وہ کتاب چھاپنا پہلے پسند کرتا ہے جس کا پرنٹ رن زیادہ ہو۔

میں ایک بار پھر اس بات پر زور دوں گا کہ کتابت سے دھیرے دھیرے دامن کشی کی جائے اور ٹائپوگرافی کا طریقۂ اشاعت بچوں کے قاعدے سے شروع کیا جائے۔ اس طرح نئی پود کو ٹائپ پڑھنے کا عادی بنانا پڑے گا۔ نصابی کتابیں ٹائپ میں ہی دستیاب کرانے میں سہولت رہے گی اس میں وقت بھی بچے گا لاگت بھی کم آئے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم دوسری زبانوں کے دوش بدوش چل سکیں گے۔ اب جب کہ تعلیم میں پیہم ترقی اور توسیع ہو رہی ہے نئی نئی اسکیمیں بن رہی ہیں، تعلیم کا معیار اونچا ہو رہا ہے اور کسی حد تک اردو طلبا کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے، طباعتی اور اشاعتی سہولتیں آسانی سے میسّر ہیں اس لیے توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو کی نصابی کتابوں کے مسائل بھی حل ہو سکیں گے۔ اور اردو کے طالب علم بھی اپنی نصابی کتابیں اتنی ہی آسانی اور سہولت سے حاصل کر سکیں گے جتنی آسانی اور سہولت سے انگریزی، ہندی اور ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی نصابی کتابیں مل جاتی ہیں۔ آیئے اس سلسلے میں ہم سب تعاون کریں۔

مشکور علی صدیقی

سہ لسانی فارمولے میں اردو نصاب کی حیثیت

سہ لسانی فارمولے پر غور وفکر کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ فارمولا کیوں بنایا گیا اور اسے کیوں لاگو کیا گیا۔ یہ سمجھنے کے لیے ہندوستان کے سیاسی اور لسانی مسائل پر غور کرنا ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے دیگر ممالک سے ہندوستان کے لسانی حالات مختلف ہیں۔ دیگر ممالک میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہوتی ہے اور ثانوی درجات میں مادری زبان کے علاوہ غیر ملکی زبانیں طالب علم اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق پڑھتا ہے۔ لیکن ہندوستان اور سوویت یونین میں مسئلہ مختلف ہے۔ ان دونوں ممالک میں یہ مسئلہ کچھ ملتا جلتا ہے۔ سوویت یونین میں مادری زبان کے علاوہ ایک ریاستی زبان پڑھائی جاتی ہے۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں مختلف مذاہب اور لسانی فرقوں کے لوگ رہتے ہیں اور جو مختلف تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہے، لاتعداد زبانوں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ کشمیر سے راس کماری، گجرات سے بنگال تک اپنی رنگارنگی اور عظمت کے لیے مشہور ہے۔

اس عظیم ملک میں لاتعداد زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے ۵۸ زبانیں ہندوستان کے مختلف اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں اور ۱۶ زبانوں کو دستوری حیثیت حاصل ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ کلاسکی زبانیں اور غیر ملکی زبانیں پڑھانے کا رواج ہے۔

ایسے ملک میں جہاں ۱۶ زبانوں کو دستوری حیثیت حاصل ہو اور ایک زبان قومی زبان کی حیثیت سے پڑھائی ہو اور انگریزی زبان کو نظر انداز نہ کیا جاسکتا ہو یعنی ہندی اور انگریزی کا پڑھانا

لازمی ہو اور دیگر علاقائی زبانوں کو بھی جگہ دینی ہو ایسا کرنے کے لیے کوئی ایسا فارمولا بنانا ضروری تھا جس کے ذریعے ہندی فروغ پاسکتی اور قومی زبان کاروباری زبان اور علاقائی زبان کی تعلیم دی جاسکتی۔ لہٰذا آزادیِ ہند کے بعد ہندوستان کے اکثریتی طبقے نے جو ہندی کو اپنی زبان سمجھ کر اسے فروغ دینا اور اسے رابطے کی زبان بنانا چاہتا تھا زبان کے مسئلے کو سیاسی رنگ دے دیا۔ حکومت ہند نے ہندی کو قومی زبان کا شرف بخشا اور اسکولوں میں اسے لازمی طور پر پڑھنے کا اعلانیہ جاری کر دیا لیکن اس اعلان سے مسئلہ حل نہیں ہوا کیونکہ علاقائی زبانوں کو دوسری زبان کی حیثیت سے اور انگریزی کو کاروباری زبان ہونے کی وجہ سے پڑھانے کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ۱۹۵۶ء میں مرکزی تعلیمی بورڈ نے لسانی فارمولے پر غور کیا۔ ریاستی اور علاقائی زبانوں کے پڑھائے جانے کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کے بعد بیک وقت تین زبانیں پڑھنے پر زور دیا گیا۔ اسی کو سہ لسانی فارمولا یا Three Language Farmula کہتے ہیں۔ اس فیصلے کے ۵ سال بعد ۱۹۶۱ء میں اسے ریاستی سطح پر لاگو کرنے کا فیصلہ ہوا اس فیصلے کے بعد سہ لسانی فارمولے کے لاگو ہوتے ہی لسانی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنوب میں ہندی مخالف تحریکات شروع ہوئیں۔ کیونکہ اس فارمولے کے لاگو ہونے سے مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوئے جو فطری تھے عام طور سے یہ خیال کیا جانے لگا کہ علاقائی زبانیں دب کر رہ جائیں گی۔ جنوب کے لوگوں نے اسے اپنے اوپر ہندی کو تھوپے جانے سے تعبیر کیا۔ اس لیے یو۔پی اور دیگر علاقوں میں ذمہ دارانِ نصابِ تعلیم نے اس فارمولے کو اس طرح لاگو کیا کہ طالب علم صرف ہندی انگریزی اور سنسکرت پڑھ سکے کیونکہ ہندی کے ساتھ سنسکرت ہی پڑھنا بہتر ہے۔ اور یو۔پی۔ بہار، آسام، بنگال، اڑیسہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور ہماچل پردیش وغیرہ میں زیادہ تر ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں یہ خیال پیدا ہونا قدرتی تھا کہ علاقائی زبانوں کے پھلنے پھولنے اور ان کے فروغ کے مواقع مسدود ہو جائیں گے۔ اس فارمولے کے مطابق اسکولوں میں جو کمبنیشن سامنے آیا اس کے مطابق ہندی قومی زبان کی حیثیت سے پڑھنی تھی۔ انگریزی کاروباری زبان ہونے کی وجہ سے پڑھنی تھی۔ اس کا کمبنیشن علاقائی زبانوں سے کر دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں علاقائی زبان کو چھوڑ کر کاروباری زبان پڑھنا ضروری سمجھا جاتا ہے اس لیے طلبا انگریزی کو دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھتے رہے ہیں۔ تیسری زبان پڑھنے کے لیے سنسکرت، فارسی، عربی اور دیگر علاقائی

یا کلاسیکی زبانوں کا کمبنیشن رکھا گیا تھا اس کمبنیشن کے مطابق سنسکرت کا پڑھنا ضروری خیال کیا گیا لہٰذا ہر بچہ آج بھی ہندی، انگریزی اور سنسکرت پڑھنا پسند کرتا ہے عام طور سے نہ صرف ہندی علاقوں بلکہ غیر ہندی علاقوں کے اسکولوں میں بھی بچے ہندی، انگریزی اور سنسکرت پڑھ رہے ہیں اور اپنی مادری زبان پڑھنے سے محروم ہیں۔

زبانیں ملک اور قوم کا سرمایہ ہوتی ہیں جن کی حفاظت اور سرپرستی حکومت وقت کرتی ہے یا پھر وہ قومیں کرتی ہیں جو ہر قیمت پر اپنی زبان کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ متعصب اور تنگ نظر افراد نے جنھیں ذمہ دار کہا گیا ہے انگریزی بین الاقوامی زبان کو بھی نظر انداز کرنا چاہا لیکن اس کے بغیر دفاتر کا کام چلنا مشکل ہو گیا تھا نتیجے میں مجبوراً انگریزی کو مزید پندرہ سال کے لیے اپنا نا منظور کیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان لوگوں کے بچے ہمیشہ انگریزی پڑھتے رہے جو انگریزی کے خلاف نعرے لگاتے رہے ہیں اور ہندی کو اپنانے کا ڈھونگ رچاتے رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر یہ مثال چسپاں ہوتی ہے کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور، اسی کو سیاسی مصلحت بھی کہا جاتا ہے جس سماج کا یہ حال ہو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

اس فارمولے کے مطابق غیر ہندی مادری زبان والے طلبا کو اپنی اپنی خواہش اور علاقائی ضرورتوں کے مطابق تین زبانیں پڑھنے میں جو دشواریاں پیش آئیں ناگفتہ بہ ہیں اور وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اس فارمولے کے لاگو ہونے سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے اردو طلبا رہے۔

اردو جو ہندی کی سگی بہن ہے، ہندوستان ہی کی کوکھ سے پیدا ہو کر یہیں پلی بڑھی اور پروان چڑھی اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں اپنے نغموں سے مجاہدین آزادی کے دلوں کو گرمایا، ان کی ہمت افزائی کی اور انھیں حوصلہ بخشا عوام کے دلوں میں قربانی کا جوش اور جذبہ اور ان کی رگ رگ میں آزادی حاصل کرنے کا جوش بھرنے کا شرف حاصل کیا۔ ع

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

یہی اردو کا وہ نغمہ تھا جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جوان اور بوڑھا مرد اور عورت گا گا کر اپنی قربانیاں

پیش کرتا تھا۔ انقلاب زندہ باد اردو ہی کا نعرہ تھا جس نے انگریزوں کے حوصلے پست کردیے تھے اور انگریزوں کو ملک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ہی نہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

یہ ترانہ وہ ترانہ ہے جو آج بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے، نہ جانے کتنے گیت اور کتنی نظمیں اردو کی دین ہیں جنھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا:

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا جذبہ ہمیشہ پیدا کرتا رہا۔ لاتعداد تقریریں اور تصانیف اردو کی ایسی ہیں جن سے آزادی کی آگ کے شعلے اس طرح بلند ہوئے اور آگ ایسی بھڑکی کہ انگریزوں کی حکومت کو جلا کر خاک کر دیا۔ وہ یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن افسوس کہ آزادی کے بعد اسی مقدس زبان کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اور رقابت کا نشانہ بنی۔

سہ لسانی فارمولا لاگو ہونے کے بعد اردو کے رقیبوں نے وہ تمام کوششیں کیں جن سے اردو فروغ نہ پاسکے اسے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم نہ ہو سکے۔ نصاب تعلیم میں ہر ریاست نے اردو کو اس طرح جگہ دی کہ وہ بے جگہ ہو گئی۔ ہندی اور انگریزی میڈیم اسکولوں میں اس فارمولے کے مطابق طالب علم کو ہندی، انگریزی اور سنسکرت کا پڑھنا لازمی ہو گیا۔ یہ ہی نہیں کہ یہ اصول صرف ان اسکولوں میں لاگو کیا گیا جو ہندی علاقوں میں ہیں اور انھیں ہندی یا انگریزی مادری زبان کا سماج چلا رہا ہے بلکہ ان میں بھی لاگو ہوا کہ جن اسکولوں کو اردو سماج کے لوگ چلا رہے ہیں۔ دہلی، یوپی اور بہار خاص طور سے شامل کیے جاسکتے ہیں۔

دہلی میں گورنمنٹ کے ماڈل اسکولوں میں بھی اردو طالب علم اردو نہیں پڑھ سکتا کیونکہ نصاب تعلیم میں کمبنیشن کے مطابق یا تو انگریزی کو خیر باد کہنا پڑے گا یا اردو کو چھوڑنا پڑے گا۔ ظاہر ہے اردو ہی چھوڑنی پڑتی ہے۔ دہلی ایک ایسی ریاست ہے جہاں اردو میڈیم اسکول نہ صرف پرائمری بلکہ سینئر سیکنڈری بھی ہیں لیکن بات صرف یہ ہے کہ جو اردو میڈیم اسکول ایڈیڈ ہیں ان میں تو اردو ذریعۂ تعلیم سے پڑھایا جاتا ہے لیکن گورنمنٹ اسکولوں میں یہ سہولت فراہم نہیں ہے وہ نام کے اردو میڈیم اسکول ہیں۔ زیادہ تر مضامین ان اسکولوں میں ہندی یا انگریزی میں پڑھائے جا رہے ہیں کیونکہ

اردو میڈیم ٹیچرز نہیں ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ اردو میڈیم اسکولوں کا رزلٹ ۱۵ فیصدی سے ۳۵ فیصدی تک رہتا ہے۔ اس سے زیادہ برا حال دیگر ریاستوں کے اسکولوں میں ہے جس کی شکایات ہم ہر روز اخبارات میں پڑھتے ہیں۔ گورنمنٹ کی ہدایات کے جاری کرنے کے باوجود کہ اردو کو پڑھانے کا معقول انتظام کیا جائے' یہ ہدایات ایسے نظر انداز کی جاتی رہی ہیں جیسے ہدایات ملی ہی نہیں۔ حالانکہ دستور ہند کی دفعہ ۲۹ میں اقلیتی طبقات کو خواہ وہ ملک کے کسی بھی خطے میں رہتے ہوں یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مخصوص زبان، رسم الخط اور تہذیب و تمدن کا تحفظ کر سکیں اور اپنے بچوں کو اپنی خواہش کے مطابق پڑھا سکیں۔ ملک کے دستور میں دفعہ ۲۸-۲۹ اور ۳۰ کے مطابق مذہبی تعلیم دلانے اور لسانی ادارے قائم کرنے کا پورا پورا حق دیا گیا ہے۔ لیکن مشاہدات اور تجربات سے ثابت ہے کہ یہ صرف کاغذی خانہ پُری ہے، حقیقت میں عمل اس کے خلاف ہے یہ صورت حال کسی بھی لسانی اقلیت کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے محروم کرنے کے لیے کافی ہے کیونکہ تعلیم ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے اقلیتیں اپنی نسلوں میں اپنی تہذیب و تمدن اور مذہبی اقدار و روایات کو منتقل کرتی ہیں۔

اس فارمولے کے مطابق یو۔پی کے اداروں کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ وہاں بھی یوپی ایجوکیشن بورڈ اردو کی تعلیم میں حائل ہے۔ اردو میڈیم کے لوگ بھی اگر اپنے ادارے میں اردو پڑھانا چاہیں تو بورڈ کی ہارڈ اسٹک کے مطابق نہیں پڑھا سکتے۔ یوپی کے گنے چنے اسکول ہیں جہاں نویں اور دسویں جماعت میں طلبا اردو پڑھتے ہیں لیکن ان طلبار کو انگریزی سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اگر انگریزی کمبینیشن فارسی عربی اور سنسکرت کے ساتھ ہوتا تو یہ مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتا تھا۔ سائنس کا طالب علم تو اردو نویں اور دسویں جماعت میں پڑھ ہی نہیں سکتا۔ یہ تو گورنمنٹ کی بے نیازی کہیے لیکن کیا کبھی ہم نے اپنا بھی جائزہ لیا ہے؟ کتنے افراد ہیں جو یہاں موجود ہیں اور اردو کے ذمہ دار کہلاتے ہیں وہ اپنے سے سوال کریں کہ کیا ان کے بچے اردو پڑھ رہے ہیں؟ انگلش میڈیم سے پڑھانے کے بھوت نے اردو والوں کو بھی اردو سے دور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں جو تصانیف اور جو کلام آج اردو کا شائع ہو رہا ہے، اسے پڑھنے والا کوئی نہ ہوگا اور ان ادیبوں اور شاعروں کی روح ان کی تخلیقات تباہ ہوتے دیکھ کر تڑپتی رہے گی۔ گورنمنٹ سے تو شکوہ ہمیں ہے ہی لیکن ہمیں اپنا بھی جائزہ لینا ہوگا۔

عبداللہ ولی بخش قادری

ثانوی مدارس میں اردو ادب کا نصاب

ہر ملک یا سماج اپنا فلسفۂ حیات رکھتا ہے جس کی روشنی میں اُس کے نظام تعلیم کے نصب العین کا تعین ہوتا ہے جو کہ نصابِ تعلیم کے مقاصد مقرر کرنے کا باعث بنتا ہے۔ عموماً فلسفۂ تعلیم کو درس و تدریس سے غیر متعلق تصور کیا جاتا ہے، بالخصوص ابتدائی اور ثانوی منزل پر، اور تعلیم کے نظری و عملی پہلوؤں کو ایک دوسرے سے غیر متعلق گردان لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر استاد کسی نہ کسی فلسفۂ تعلیم کا پیرو ہوا کرتا ہے اور اُس کے عمل کے پس پشت کوئی فلسفۂ تعلیم ضرور کار فرما ہوتا ہے۔ غالباً ایسا کوئی اور کارکن نہیں ہے جس کا عمل اُس کے فلسفے سے اِس قدر متاثر ہوتا ہو جیسا کہ ایک استاد کی کارگزاری۔ لہٰذا ایک نصابِ تعلیم میں سب سے پہلے تعلیمی مطمحِ نظر کی وضاحت درکار ہوتی ہے۔ پھر اُس کے مطابق اصولوں اور ضابطوں کو طے کیا جاتا ہے جن کی روشنی میں بچوں کی تربیت کا پروگرام ترتیب پاتا ہے۔ ایک نصابِ تعلیم اُن تمام تجربات پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں مدرسہ اپنے بچوں کو بالارادہ اور منضبط طریقے پر بہم پہنچاتا ہے۔ اُس میں تعلیمی مواد کے علاوہ تربیتی اور تدریسی مشاغل بھی شامل ہوتے ہیں یہی تعلیمی مواد اپنی مرتب اور منضبط شکل میں نصاباتِ مضامین کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ نصابِ تعلیم میں ایک طرف ایسا تعلیمی مواد داخل کیا جاتا ہے جس کا تعلق سماجی اور طبیعی علوم سے ہوتا ہے جن کے ذریعے بچوں کو ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہے اور اُن کی بدولت وہ زندگی کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مضامین بھی ہیں جو واقفیت سے زیادہ مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور تربیتِ ذہن سے زیادہ تربیتِ ذوق کا موجب بنتے ہیں جیسے ادب اور فنونِ لطیفہ۔ یوں مختلف نوعیت رکھنے والے

مضامین دراصل ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہیں۔ اُن میں فرق صرف اِس قدر ہے کہ بعض اِفادی اور مادّی پہلو زیادہ رکھتے ہیں اور بعض کا زور، جذبے کی تسکین اور حسن سے لطف اندوزی پر ہوتا ہے لیکن شخصیت کی تعمیر میں دونوں طرح کے مضامین ہم دوش ہوا کرتے ہیں۔ البتہ ادب کا ایک پہلو، بلکہ ایک نہایت اہم پہلو، اُس کی خلاّقانہ صفات ہیں۔ وہ اِنسانی جذبات واحساسات کے ایسے مرقعے تشکیل کرتا ہے جو نظم و نثر کے شاہکار قرار پاتے ہیں اور جن سے دِلوں کو گرمانے کا ہی کام نہیں لیا جاتا بلکہ وہ انسانیت کو راہ دکھانے اور مہذّب بنانے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ بہر کیف نصابِ تعلیم کا سب سے اہم جزو نصاباتِ مضامین ہوتے ہیں اور مدرسے کی توجہ کا نقطہ ارتکاز اُن ہی کو کہا جائے گا۔ ثانوی مدارس میں اردو ادب کے نصاب سے متعلق مسائل کا جائزہ لیتے وقت ہمیں سب سے پہلے اردو کی موجودہ کیفیت اور حیثیت پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے تا کہ حقیقت پسندانہ طور پر اُس کے مواد کو متعین کیا جاسکے۔

اوّل تو اپنے دیس کی اِس روش کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے تاریخی، سماجی، اور نفسیاتی اسباب کی بنا پر ہماری تعلیم میں مادری زبان کی طرف کماحقہٗ، توجہ نہیں رہی ہے اور ہماری بوالعجبی کا یہ عالم ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد بھی ہم اپنی زبانوں کے سلسلے میں بہت کچھ کام زبانی جمع خرچ سے ہی چلا رہے ہیں۔ اِس معاملے میں سماج کے اندر زبردست دوعملی دکھائی دیتی ہے۔ اِس عام کم نگاہی اور بے شعوری کا شکار ہونے کے علاوہ اردو کے حصّے میں کچھ اور بھی غم آئے ہیں۔

سیاستِ روزگار نے اُسے نہ صرف مسند سے ڈھکیل دیا ہے بلکہ اس پر عرصۂ حیات ہی تنگ کر رکھا ہے۔ آج نہ صرف ادب کی تخلیق واشاعت محدود ہو کر رہ گئی ہے بلکہ اس سے نئی نسل کو آشنا کرنے کے مواقع بھی برابر محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اب اُس کی جگہ نہ عدالت میں باقی رہی ہے، نہ تجارت میں اور نہ حکومت میں۔ رہا کبھی کبھار مشاعرہ جما کر دل خوش کر لینے کا معاملہ تو وہ بھی تحسینِ ناشناس کی گرد میں دبتا چلا جا رہا ہے۔ اردو داں طبقے کی نئی نسل کے پاس صرف اپنے گھر اور اپنے معمولی سے مدرسے کی مختصر سی چہار دیواری باقی بچی ہے جہاں وہ اپنی زبان کا عمل دخل دیکھ سکتی ہے۔ ہم جانتے ہیں بلکہ جھیلتے ہیں جو تعلیمی، سماجی، معاشی دشواریاں اردو کے فروغ میں حائل ہیں۔ لیکن مایوس ہونے کا سوال نہیں ہے۔ ہمارا آئین ہمارے ساتھ ہے۔ اُس میں مادری زبان کا مقام

محفوظ ہے۔ دفعات ۲۹۔ اور ۳۰ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ سماج کے ہر طبقے کو اپنی زبان، رسم الخط یا تہذیب کے تحفظ کا پورا حق حاصل ہے۔ نیز اسی طرح لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق دیا گیا ہے اور یقین دلایا گیا ہے کہ کسی بھی اقلیتی تعلیمی ادارے کے ساتھ امداد کے معاملے میں کوئی بے جا امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ لہٰذا ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اردو کے خلاف موجودہ تنگ دلی جلد دور ہوگی اور آزادی کی جدوجہد کے دوران جس زبان میں 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے نے دلوں کو گرمایا تھا وہ دیر تک موجودہ سیاسی سرد مہری کا شکار نہیں رہے گی۔ لیکن فی الحال اِن حقائق کو مدِ نظر رکھ کر ہی ہمیں ثانوی مدارس میں اردو ادب کا نصاب طے کرنا ہوگا۔

بے شک موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ اردو کو آسان اور عام فہم بنانے، مقامی رنگ قبول کرانے اور اس کے دامن کو کشادہ تر کرنے کی کوششیں شعوری طور پر برابر جاری رہیں۔ اِسی طور وہ عوام کے دلوں میں اپنی جگہ برقرار رکھ سکے گی اور اس کی افادیت میں اضافہ ممکن ہوگا۔ یہ بات اطمینان کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے تخلیق کار وقت کی اِس ضرورت سے غافل نہیں رہے ہیں لیکن زبان کو عوام کے قریب لانے کا کام بڑی چابک دستی سے کرنے کا ہے۔ بول چال کی زبان کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ نہیں بھول جانا چاہیے کہ زبان کے ادبی اور علمی پہلو بھی اپنا الگ الگ منصب رکھتے ہیں۔ اُن سے زبان مستحکم اور معیاری بنتی ہے۔ اُن ہی سے صحیح طور پر معنی کا تعین ہوتا ہے۔ ایک پختہ جاندار اور نمو پذیر زبان کئی رُخ رکھتی ہے۔ اُسے نہ صرف شکوہِ الفاظ کا جادو جگا کر سر چڑھایا جاسکتا ہے اور نہ محض چلتی پھرتی جنسِ بازار گردان کر آبرو دار بنایا جاسکتا ہے۔ زبان محض ایک ذریعۂ ترسیل ہی نہیں ہے بلکہ اظہار و فروغِ ذات اور خلّاقیت کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے جس کی بدولت فرد اپنی عینیت حاصل کرتا اور اُسے برقرار رکھتا ہے۔ تخلیقی ادب سے زبان میں صرف آب نہیں آتی ہے بلکہ وہ اس کے لیے آبِ حیات بھی ہے۔ کوئی زبان تاوقتیکہ علمی وقار حاصل نہ کرے، وہ برقرار نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا ہمیں ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اردو کی بقا اور ترقی کے لیے اُس کے ادب کا تحفظ، نئے ادب کی تخلیق، اور ادبی و علمی سرمایے کی ترویج و اشاعت سب ہی کچھ درکار ہے۔ تب ہی وہ ایک مکمل جدید زبان کی حیثیت سے اپنا منصب ادا کرسکتی ہے۔ لہٰذا ثانوی مدارس میں اردو ادب سے متعارف کرانے کا کام نہایت حقیقت پسندانہ اور عملی نقطۂ نظر سے کرنا ہوگا۔ اِس سلسلے میں اِقدام پر غور کرنے سے

قبل نصابِ تعلیم سے متعلق چند باتیں عرض کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

کوٹھاری کمیشن (۶۶-۱۹۶۴) نے نصابِ تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے متعدد مفید مشورے دیے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ نصابِ تعلیم کو موجودہ مسائل اور مواقع کے مطابق بنایا جائے نیز مدارس کو ریاستی سطح پر تیار کردہ 'برتر نصاب' اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح ایک مدرسے میں کسی خاص مضمون یا چند مضامین میں عام نصاب کے ساتھ ساتھ 'برتر نصاب' بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک مدرسے کو ہر مضمون میں 'برتر نصاب' اختیار کرنا لازم نہیں آتا ہے اور ایک طالب علم کے لیے نجی طور پر اس نصاب کی بھی تیاری کرنے کی گنجایش رکھی گئی ہے جو کہ اس کے اپنے مدرسے میں رائج نہیں کیا گیا ہے۔ اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ امتحان کی سہولت عام نصاب' اور 'برتر نصاب' دونوں کے ذریعے حاصل رہے گی۔ اس کام کا آغاز کرنے کے لیے جن چند مضامین کی طرف نگاہ اٹھی ہے ان میں سے ایک زبان بھی ہے۔ اس وقت یہ بات اس لیے یاد دلائی گئی ہے کہ 'برتر نصاب' کی تجویز اردو کے اساتذہ کے لیے ایک موقع بھی ہے اور چنوتی بھی۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر نہ صرف اردو کے نصاب سے مردہ اور فرسودہ مواد خارج کر دینا ضروری ہے بلکہ معیار کو بلند بھی کرنا ہے تاکہ ہم اپنے نصاب کو سب ہی کے لیے صحیح مفہوم میں 'برتر نصاب' فراہم کر سکیں اِس غرض سے ہمیں اردو کی تدریس پر لگاتار زیادہ جانفشانی اور مستعدی کے ساتھ توجہ کرنی ہوگی اردو کے "شاہدِ مقصود" کو حاصل کرنے کے لیے عشاق کو "سعی کے پاس" جانا ہی پڑے گا اور اپنے آپ کو "جوئے شیر و شیشہ و سنگِ گراں" کی روایت کا امین ثابت کرنا ہوگا۔

اردو نصاب کے متعلق مندرجہ بالا چند معروضات کے بعد اب نصاب کے عام مقاصد کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یوں تو جہاں تک کسی نصابِ مضمون کے عام مقاصد کا تعلق ہے، اُن کا تعین نصابِ تعلیم کے تحت ہو ہی جاتا ہے اور اس اعتبار سے تمام مضامین کے عام مقاصد یکساں ہی ہونگے البتہ ہمیں یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ اردو ادب کا موجودہ نصاب کس حد تک اُن کی آبیاری کرتا رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ نصابِ تعلیم کے ذریعے قومی مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں اور ہمارے قومی مقاصد میں حب الوطنی، قومی یک جہتی، سائنسی فکر کا فروغ نیز جمہوری اور سیکولر اقدار کی آبیاری خاص اہمیت رکھتے ہیں اب جہاں تک دیش پریم اور آپس میں میل ملاپ کے جذبات کا تعلق ہے یہ سب کچھ تو

اردو کے خمیر میں ہی شامل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی تعلیمی منزل پر اردو ادب کے نصاب میں وطن دوستی، قومی یک جہتی، اور جذباتی ہم آہنگی جیسے احساسات وجذبات کی کمی کبھی نہیں پائی گئی ہے اس عام تاثر کی تائید میں ایک تحقیقی مطالعے (برائے ایم ۔ ایڈ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۷۴) کے نتائج کا ذکر بے محل نہ ہوگا ۔ اِس مطالعے میں اتر پردیش کے اندر نویں اور دسویں جماعتوں میں پڑھائی جانے والی اردو کی درسی کتابوں میں حب الوطنی کے جذبات کا جائزہ لیا گیا تھا نثر کی تین کتابوں 'ہماری کتاب' 'شاہکار نثر' اور 'قومی ادب' میں واضح طور پر ۲۳ اسباق میں سے ۸ کے اندر، ۲۵ میں سے ۱۱ کے اندر اور ۴۲ میں سے ۱۶ کے اندر بالترتیب حب الوطنی کے جذبات پائے گئے تھے ۔ جہاں تک اِس نصاب کے حصۂ نظم کا تعلق ہے مقالہ نگار کے مطابق اس کی عام فضا اس جذبے سے معمور پائی گئی تھی حتٰی کہ غزل اور قصیدے میں بھی یہ رنگ جگہ بہ جگہ جھلکتا ہوا پایا گیا ہے، نظموں کا پوچھنا ہی کیا ۔ اسی طرح ایک دوسرے تحقیقی مطالعے (برائے ایم ۔ ایڈ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۸۳) میں قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے دہلی میں نویں اور دسویں جماعتوں کے اندر پڑھائی جانے والی اردو کی درسی کتب کی جانچ سے پتہ چلا کہ نثر کے ۱۱ ۔ اسباق میں سے ۳ ۔ اور نظم کے ۱۲ میں سے ۲ بالکل صاف صاف اس جذبے کو ابھارتے ہیں اور ۱۶ ۔ اسباق اس اعتبار سے بے رنگ ہیں ۔ اب ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اردو کے نئے نصابات ترتیب دیتے وقت کسی طور بھی حب الوطنی، قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی لے دھیمی نہ ہونے دیں بلکہ اُسے برابر تیز کرتے رہیں ۔ یہ توقع اردو کے مزاج کے عین مطابق ہے اور شعوری طور پر اس بات کا لحاظ رکھنے سے اردو ادب کا نصاب اِس معاملے میں یقیناً نمونے کا کام کر سکے گا ۔

دیگر عام مقاصد کے تحت اخلاقی اقدار کی ترویج و تبلیغ اور مثبت وصحت مند رویّوں کا اظہار و قبول شامل ہے ۔ اردو ادب اِس معاملے میں بھی نمایاں رہا ہے اور اس کے نصابات میں قدروں کی آبیاری ہمیشہ ہوتی رہی ہے البتہ بے خیالی میں ایسے ادبی نمونے بھی شامل نصاب ہوتے رہے ہیں جو اپنے اندر منفی اور غیر صحت مند رویّوں کا دخل رکھتے ہیں ۔ ایک معیاری نصاب کو اس قسم کی کمزوریوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے ۔ اِس ضمن میں ایک تحقیقی مطالعے (برائے ایم ۔ ایڈ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۶۸) کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں ساتویں جماعت کی اردو کتاب کے اندر ۴۲ ۔ اسباق میں سے ۴۲ کے اندر مثبت اور صحت مند رویّوں کی کارفرمائی پائی گئی لیکن ۶ میں منفی اور غیر صحت مند رویّوں کا

عمل دخل بھی نظر آیا جبکہ ۱۲ اس اعتبار سے بے اثر پائے گئے۔ اسی طرح آٹھویں جماعت کی اردو کتاب میں ۶۹ اسباق میں سے ۱۲ کے اندر تو مثبت اور صحت مند رویے سرایت کرتے ہوئے پائے گئے تھے مگر ۱۳ اسباق میں منفی اور غیر صحت مند رویوں نے اپنا رنگ جما رکھا تھا۔ باقی ماندہ ۴۴ اسباق اِس معاملے میں بے تعلق یا معصوم ہی نکلے۔ ایک موثّر اور معتبر نصاب کے لیے ایسی صورتِ حال قابلِ قبول نہیں ہوسکتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے کردار میں تبدیلی لائی جاتی ہے، ایسی تبدیلی جو فرد اور سماج دونوں کے لیے مفید اور موثر ثابت ہو۔ ایسے اسباق جو بے تاثیر ہوتے ہیں وہ بلا شبہ بے جان بھی ہوں گے اور نصاب میں ان کی بہتات اُس پورے نصاب کو کمزور اور بے کیف بنانے کا موجب ہوگی۔ لہٰذا ایسے کورے اور کور ذوق اسباق کو نصاب میں داخل کرنے سے گریز کرنے کی ضرورت ہے اور اِن سے بھی بڑھ کر منفی اور غیر صحت مند رویوں کی نصاب میں دخل اندازی کی طرف سے چوکنّا رہنے کا سوال ہے۔ درسی اسباق میں اُن کی موجودگی، زود حس، اثر پذیر اور نوخیز ذہنوں پر ہمیشہ کے لیے تاریک خیالی، تقدیر پرستی، اوہام پروری، رجعت نوازی، قنوطیت پسندی، تاویل گردی جیسے دشمنِ تعمیر و ترقی رویوں اور طرزِ فکر کے جالوں کو تان دینا ہے اور ساری زندگی کے لیے روشن خیالی، سائنسی فکر، رجائیت، خود اعتمادی جیسے رجحانات کے فروغ سے انھیں محروم کر ڈالنا ہے۔

اِسی تسلسل میں درسی اسباق کے نفسِ مضمون کے بارے میں بھی ہمارا نقطۂ نظر صاف ہونا چاہیے ہمیں نصاب کو اِس نظر سے بھی دیکھنا ہوگا کہ اُس کے موضوعات کیا ہیں۔ یہ بات ہمیشہ اہم رہی ہے اور اَب حالات نے اسے کچھ اور اہم بنا دیا ہے۔ کیونکہ زبان کو برتنے اور مطالعہ کرنے کے مواقع برابر کم ہوتے جارہے ہیں اس لیے درسی کتاب پر بہت کچھ تکیہ کرنا ہے۔ ایک طرف ہمیں مفید، با معنی اور با مقصد موضوعات کو خاص طور پر نصاب کے اندر جگہ دینی ہوگی اور دوسری طرف یہ انتخاب جامع بھی ہوگا اور متنوع بھی۔ نیز اُس ہی کے وسیلے سے خاطر خواہ طور پر ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کی کوشش کی جائے گی۔ نصاب ہی کے ذریعے گرد و پیش کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے اور اسی کو قومی ماحول کا آئینہ دار بنانا ہے۔ اُسی کے سہارے بین الاقوامی مفاہمت اور عالمی برادری کے تصور کو اُبھارنا ہے۔ وہی تازہ سائنسی معلومات اور تکنیکی ترقی سے متعارف کرانے کا وسیلہ ہے، اُسی کو ذوقِ تجسس اُبھارنے اور مزید مطالعے کے لیے آمادگی پیدا کرنے کا موجب ہونا ہے اور اُسی کے

ذریعے زندگی کے مختلف گوشوں سے روشناس ہونا ہے۔

ادب کے نصاب میں اخلاقی اور سماجی اقدار کی جلوہ سامانی کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص تہذیبی ورثے اور روایات کا بھی پورا پورا احترام ہونا چاہیے۔ تہذیب ہی اپنے ماحول کا وہ جزو ہے جسے خود انسان بناتا ہے۔ ایک پسندیدہ نصاب وہ ہوتا ہے جو کسی تہذیبی نقطۂ نظر کو متوافق طور پر پیش کرتا رہتا ہے اور مختلف تہذیبی عناصر میں باہمی مطابقت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کے سامنے معاشی زندگی کے تقاضے بھی رہتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ذہن میں یہ بات بھی رکھنی ہے کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی یلغار نے آدابِ زندگی کو بری طرح متاثر کر دیا ہے بلکہ نظامِ اقدار کی طرف سے ایک بے اطمینانی سی پیدا کر رکھی ہے۔ لیکن اقدار ہی وہ ضابطے ہیں جن سے انسان اپنا کردار درست کرتا ہے اور حوصلہ پاتا ہے۔ ایک بچّہ اپنے تہذیبی پس منظر اور سرمایے کے ساتھ جماعت میں داخل ہوتا ہے۔ نصاب کو قدامت پرست اور ترقی پسند دونوں ہونا چاہیے۔ ہمیں تہذیبی ورثے کی تردید نہیں، تجدید کرنی ہوتی ہے۔ نصاب کا مواد اور اس کے مقاصد ایک دوسرے کے ساتھ ذرائع اور مقصودات کا سا تعلق رکھتے ہیں ہمیں اپنے نصاب کے مواد کو اسی نظر سے دیکھنا ہے۔ لہٰذا 'موضوع رُخ طرزِ نظر' اختیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نفسِ مضمون کی اہمیت ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ خصوصیت صرف زبان و ادب کے نصاب کی ہوتی ہے کہ اُس کے اندر کسی بھی علاقے سے مواد داخل ہو سکتا ہے، اس اعتبار سے اس کا دامن کشادہ رہے گا لیکن دسویں جماعت تک اردو ادب کے نصاب میں اپنے دَور کا نمائندہ ادب پیش کرنا کافی ہے۔ اِس منزل پر نہ پورے ادب کی نمائندگی درکار ہے اور نہ ادبی ادوار کے لحاظ سے انتخابات پیش کرنے کی ضرورت۔ البتہ ہمارا مقصد ادبی ذوق کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ موجودہ مسائل سے آشنا کرنا اور اُن پر اظہارِ خیال کے لائق بنانا بھی ہے اور اِس بات کی بھی داغ بیل ڈالنی ہے کہ متعلمین آئندہ زندگی میں علوم و فنون کا میدان سَر کرنے کے اہل بن سکیں۔ لہٰذا ادبی نثر کے دوش بدوش علمی نثر کی طرف بھی شعوری طور پر رجوع کرنا ہوگا۔

ثانوی مدارس میں اردو ادب کے نصاب سے متعلق مقاصد اور مواد پر غور کرنے کے علاوہ اس کے اندر ادب کی مختلف صورتوں اور قسموں کو جگہ دینے کے بارے میں بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔

یوں تو اب تک نویں اور دسویں جماعتوں میں ہی جملہ اسالیب و اصناف کی نمائندگی کو ضروری خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ بوجوہ، اپنی مکمل شکل میں نصاب کے اندر جگہ حاصل نہیں کر پاتے ہیں اور عموماً اُن کے کسی ایک ٹکڑے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس طور اصل شکل سامنے نہیں آتی ہے اور جزو کی حیثیت ایک 'نظم' کی سی رہتی ہے۔ مزید برآں ہمارا کوئی بھی نصاب شاید ہی بے نظیر شاہ، میر حسن، دیا شنکر نسیم کی مثنویوں کے اقتباسات سے خالی نظر آئے لیکن کیا وہ متعلقہ مثنوی سے متعارف کرا دیتے ہیں؟ یہی بات مراثی اور قصائد کے منتخبات پر صادق آتی ہے۔ کیا 'صبح کا سماں'، یا 'تلوار کی روانی' سے مرثیے کا تصور قائم ہو جاتا ہے؟ کیا کسی قصیدے کی تشبیب، اس کی حقیقت کو منکشف کرتی ہے؟ ایسا ہی ڈرامے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ اس کا منتخب حصہ بس ایک ناتمام مکالمہ تو ہو سکتا ہے لیکن ڈراما نہیں۔ اسی طرح مثلث، مخمس، مسدس وغیرہ کو بھی ایک صنف کے طور پر متعارف کرانے میں کوئی مصلحت یا خوبی نظر نہیں آتی ہے۔ گویا کہ علمِ عروض کے مطابق شاعری کی جو قسمیں ہوتی ہیں اُن کو دسویں جماعت تک بتانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس وقت تک صرف 'نظم' پڑھانا کافی ہے۔ مگر 'غزل' کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے کافی غور و خوض درکار ہے۔ ایک طرف 'غزل'، اپنی مقبولیت اور عمومیت کی بنا پر ناگزیر سی ہے اور اس عوامی ذرائع ترسیل کے دور میں اُس سے ناآشنائی ممکن نظر نہیں آتی۔ دوسری طرف آٹھویں جماعت تک اس کو نصاب میں داخل کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھنا چاہیے کیونکہ اس منزل تک پہنچنے والوں کی جذباتی اور ذہنی سطح سے 'غزل'، بالاتر آہنگ رکھتی ہے۔ یہی صورت بڑی حد تک نویں اور دسویں جماعتوں تک برقرار رہتی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی اُس سے احتراز ہی مناسب ہے۔ کیونکہ صرف جذباتی اور ذہنی سطح کی ہی بات نہیں ہے بلکہ ان جماعتوں کا موجودہ معیار، 'غزل' کی اشاریت، صناعی، اور دیگر محاسنِ شعری کے ادراک سے قطعی قاصر نظر آتا ہے۔ البتہ گیارھویں اور بارھویں جماعتوں میں اُس سے آنکھیں چار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ نثر کے مختلف اسالیب، نظم کی متعدد اقسام اور علمِ عروض کے مطابق اُس کی مخصوص صورتوں کو نصاب میں پیش کرنے کی منزل بھی یہی ہے۔

غرضیکہ ثانوی مدارس میں اردو ادب کا نصاب اپنے مقاصد، مواد اور موضوعات کے اعتبار سے نئی تشکیل کا متقاضی ہے کیونکہ اردو کے ماحول، معیار اور مقام میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔

قمر رئیس

ثانوی سطح پر اردو شاعری کا نصاب

ثانوی اور اعلیٰ ثانوی یعنی سیکنڈری اور سینیر سیکنڈری سطح پر اردو شاعری کے نصاب کی تدوین اور تدریس کا کام اب خاصہ نازک اور دشوار ہو گیا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اوّل یہ کہ اب ثانوی سطح پر جو مضامین لازمی طور پر پڑھائے جاتے ہیں ان کی تعداد پہلے کے مقابلے میں کم و بیش تین گنا ہو گئی ہے۔ طالب علم پر نصاب کا بوجھ بڑھ گیا ہے اور یہ فطری بات ہے کہ وہ نئے سماجی اور سائنسی علوم پر عبور حاصل کرنے میں زیادہ توجہ اور وقت صرف کرتا ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے لیکن یہ صرف اردو تک محدود نہیں۔ ساری دنیا میں آج اسکول کی سطح پر زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ آج کے طالب علم کی بصیرت اور آگہی زیادہ محیط اور تیکھی ہے۔ اب وہ صرف اشعار کی تشریح یا بعض شعرا کی خصوصیاتِ کلام سے متعارف ہو کر مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ شعر و ادب کی ماہیت، معنویت اور تخلیقی محرکات کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہے۔

تیسری دشواری یہ ہے کہ اردو شاعری کی تمام کلاسیکی اصناف اور اس کے بیشتر رموز و علائم فارسی شاعری سے ماخوذ ہیں اور آج کا طالب علم بالعموم فارسی زبان و ادب سے شناسائی نہیں رکھتا۔ اس لیے اردو شاعری کے لطیف اور نازک پہلوؤں سے مانوس ہونے میں اسے دقت محسوس ہوتی ہے۔

اردو میں ثانوی سطح کے جو نصابات دستیاب ہیں عام طور پر وہ پرانے نصابات کو

سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں یعنی پرانے نصابات میں کچھ ترمیم، تنسیخ اور اضافہ کرکے ایک نیا نصاب ترتیب دے دیا گیا ہے۔ یہ نصابات اس مفروضے کے تحت بنائے گئے ہیں کہ طالب علم آٹھ سال تک اردو زبان پڑھ کر آئے گا۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع ہوگا اور وہ کچھ شعری مذاق بھی رکھتا ہوگا۔ جبکہ یو۔پی اور بعض دوسری ریاستوں میں صورت حال یہ ہے کہ پرائمری کے بعد اردو کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور بہتوں کو تو پرائمری سطح پر بھی اردو سیکھنے کی سہولت میسر نہیں۔ ایسے طالب علموں کے لیے ثانوی درجات کا یہ نصاب بڑی مشکلات پیدا کرتا ہے۔

ثانوی درجات کے لیے ایسا ہی ایک معیاری نصاب 'ہمارا ادب' کے نام سے پروفیسر آل احمد سرور نے مرتب کیا ہے۔ اس کا حصۂ نظم دو سو صفحات پر مشتمل ہے اور حصۂ نثر بھی کم و بیش اتنے ہی صفحات کا حامل ہے۔ حصۂ نظم میں میر و سودا سے لے کر اصغر اور جگر تک چودہ شاعروں کی غزلیات شامل ہیں، مثنویات کے حصے میں میر حسن، نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کے اقتباسات ہیں۔ ان کے علاوہ نو شاعروں کے قطعات اور رباعیات ہیں۔ نظم جدید کے حصے میں نظیر اکبر آبادی سے جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری تک گیارہ شعرا کی نمائندہ نظموں کا انتخاب شامل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شعرائے اردو کا یہ انتخاب خاصہ نمائندہ ہے اور محنت سے کیا گیا ہے۔ جو شعری اصناف شامل ہیں ان کا تعارف بھی دیا ہے۔ اس کے علاوہ آخر میں شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر مختصر تبصرہ بھی ہے۔ اس کے باوجود یہ انتخاب آج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اوّل یہ کہ اس کی ضخامت زیادہ ہے۔ اسکولوں کے موجودہ نظام الاوقات میں زبان و ادب کی تعلیم کے لیے اتنا وقت نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ انتخاب میں شامل بیشتر کلام کلاسکی شعرا کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔ تیسرے یہ کہ غزلوں کے انتخاب میں عشق و عاشقی شاہد بازی اور رندی کے مضامین بھی شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آج اسکولوں کے نصابِ تعلیم میں جنسی تعلیم کی شمولیت پر بھی سنجیدگی سے سوچا جا رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ آج فلم اور عوامی ذرائع ابلاغ کے فیض سے بچے دس بارہ سال کی عمر میں ہی جنسی زندگی کے حقائق سے کسی نہ کسی حد تک باخبر ہو جاتے ہیں تاہم یہ مسئلہ اب بھی متنازعہ بنا ہوا ہے کہ کیا چودہ یا پندرہ سال کی عمر کے بچوں کو کلاس روم میں ایسی شاعری

پڑھانا مناسب ہوگا جس میں جنسی جذبات اور تجربات بیان ہوئے ہوں یا جو رندی اور شاہد بازی کے ترجمان ہوں۔ اختر انصاری صاحب نے اپنی کتاب 'غزل اور درس غزل' میں نصاب کے حوالے سے غزل پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے تین کو خاص اہمیت دی ہے، وہ لکھتے ہیں:

۱۔ اردو غزل کا سارا سرمایہ نہیں تو کم از کم اس کے بہترین نمونے اپنی بلند ذہنی سطح اور اعلا مفکرانہ انداز کی بنا پر اسکول کے طلبہ کے فہم و ادراک سے بالاتر چیز ہیں۔

۲۔ اردو غزل اسکول کے بچوں کے مادی ماحول سے ان کے سماجی گردوپیش کے ٹھوس حقائق سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ اور اس لیے ان کو غزل کا پڑھایا جانا نہ ممکن ہے نہ ضروری۔

۳۔ اردو غزل کا ایک قابل لحاظ حصہ ایسا ہے جو غنائی وفور اور عاشقانہ غلو سے متصف ہے اور بسا اوقات ان خصوصیتوں کے ڈانڈے بوالہوسی اور کام جوئی سے بھی مل جاتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ نوعمر طلبا کو اس کے مطالعہ کا موقع دینا کس حد تک جائز ہو سکتا ہے۔

اختر انصاری صاحب اعتراضات کا خلاصہ بیان کر کے لکھتے ہیں

"مذکورہ بالا اعتراضات میں غزل کے جن معائب یا نقائص یا ناپسندیدہ اوصاف کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو غزل کی وسیع و عریض پہنائیوں میں ایسے رقبوں کی کمی نہیں جو ان ناخوشگوار اوصاف سے مکمل طور پر یا بڑی حد تک منزہ و مبرا ہیں۔ چنانچہ اردو کا معلم ثانوی مدارس کے اردو نصاب میں غزل کی شمولیت کے لیے دو بنیادی اصول وضع کرتا ہے۔

۱۔ غزل کی تعلیم کو اسکول کے صرف بالائی طبقے سے مختص خیال کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں غزل کی تعلیم نویں یا دسویں جماعت سے قبل شروع نہ کی جائے۔

۲۔ نصاب غزل کی تدوین کے لیے اردو غزل نگاروں کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور چند متعینہ اصولوں کی روشنی میں پوری احتیاط کے ساتھ اشعار کا انتخاب کیا جائے۔"

اختر انصاری صاحب نے کتاب کے چھٹے باب میں چند "متعینہ اصول" کے تحت ہی اردو کے چھ شاعروں کی ۴۵ غزلوں اور ان غزلوں کے خاص اشعار کا انتخاب معیار و نمونے کے

طور پر پیش کیا ہے۔ یہ شاعر ہیں میر، درد، غالب، ذوق، مومن اور حالی۔ بے شک انتخاب نمائندہ اور اچھا ہے۔ لیکن ان غزلوں میں حسن وعشق کی چاشنی اور رومانی شگفتگی رکھنے والے ایسے اشعار نایاب ہیں جو نوعمر طلبہ کی دلچسپی کا باعث بن سکتے تھے۔ نتیجے میں اس انتخاب میں جو اشعار جگہ پا سکے ہیں وہ معنوی اعتبار سے لطیف ودقیق ہی نہیں ایسے مفکرانہ انداز کے حامل ہیں جن کو اختر صاحب نے ثانوی سطح کے نصاب کے لیے قابلِ اعتراض قرار دیا ہے۔ ان خشک بے رنگ، عارفانہ اور فلسفیانہ اشعار کو طلبہ کے ذہن نشیں کرانا کتنا دشوار ہوگا؟ اس کا اندازہ وہ اساتذہ بھی کر سکتے ہیں جو بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ کو بھی یہی اشعار متن کے طور پر پڑھاتے ہیں۔

جہاں تک ہائر سکنڈری نصاب کے حصۂ نثر کا تعلق ہے اس میں بھی کلاسکی نثر کے مختلف اسالیب اور نمونوں کی تدریس پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ بیشتر نصابات میں میرامن، رجب علی بیگ سرور، مرزا غالب، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار، اور سرسید کی تصانیف کے اقتباسات یا مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ بیسویں صدی کے کچھ صاحبِ طرز نثر نگاروں کی تحریریں بھی ہوتی ہیں۔ آزادی کے قبل بھی یہی رواج تھا۔ اس کے بعد بھی جزوی ترمیم کے ساتھ یہ روایت جاری رہی۔ اس سلسلے میں ثانوی سطح کے طلبہ کی نئی ضرورتوں اور نئے نصابی تقاضوں کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے۔

ضرورت اس کی تھی کہ نصاب مرتب کرنے والے ماہرین اور اساتذہ نئے سرے سے اس سارے مسئلے پر غور وخوض کرتے۔ آزادی سے پہلے ثانوی سطح پر چند مضامین ہوتے تھے اور ان میں زبان وادب کے مطالعے پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اُس زمانے کی تہذیب میں زبان پر قدرت اس کے محاوروں اور لطافتوں کی آگہی اور شعروشاعری کی بصیرت کا خاص درجہ تھا۔ اردو کے ساتھ ساتویں جماعت سے ہی فارسی لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ اکثر طلبہ مدرسوں میں اردو زبان اور دینیات وغیرہ کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر اسکولوں کی تیسری یا چوتھی جماعت میں داخلہ لیتے تھے۔ ہر طرف اردو زبان کا چرچا اور چلن تھا۔ اس ماحول میں اردو کی کلاسیکی شاعری اور نثر کی تدریس اور تفہیم کے لیے مناسب فضا تیار ہو جاتی تھی لیکن آج صورت حال اس کے برعکس ہو گئی ہے۔ ثانوی سطح پر مضامین زیادہ مشکل اور تعداد میں زیادہ ہو گئے ہیں۔ زبان و

ادب کی تعلیم پر وہ توجہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ حد تو یہ ہے کہ اب ایم۔ اے کی کاپیوں میں بھی ہم اساتذہ کو 'آزاد' کو 'آجاد'، 'خطرے' کو 'کھترا'، اور 'قانون' کو 'کانون' پڑھنے کو ملتا ہے۔ خیر یہ تو انتہائی صورت حال ہے اور اس کا تعلق تلفظ اور بیجے سے ہے لیکن آج اوسط طالب علم بھی زبان کی صحت صفائی اور محاورے کی درستی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ اسکول کے ابتدائی درجات میں بھی وہ مجبور ہوتا ہے کہ دوسرے مضامین پر زیادہ توجہ اور وقت صرف کرے۔

اس صورتِ حال میں ثانوی سطح پر اردو نصاب کی نوعیت معیار اور مقاصد پر نئے سرے سے غور کرنا ضروری ہے۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ نویں اور دسویں درجات میں آج اردو پڑھنے اور پڑھانے کا مقصود کیا ہے اور وہ کیونکر حاصل ہو سکتا ہے؟

اختر انصاری صاحب شاعری کی تدریس کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نظم و شعر کا سبق اساساً ادبی حسن شناسی کا سبق ہوتا ہے۔ نظم و شعر کی تعلیم میں نہ تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ میں لسانی قابلیت اور زباں دانی کا نشوونما ہو نہ یہ کہ اظہارِ خیال کی صلاحیت ترقی کرے بلکہ صرف اس قدر کہ وہ ان اشعار سے لطف اندوز ہوں جو پڑھائے جا رہے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ کیا آج کا طالبِ علم ابتدائی درجوں میں اردو زبان، اس کی باریکیوں اور لطافتوں پر اتنی قدرت حاصل کر لیتا ہے کہ وہ کلاسیکی شعرا کے کلام سے کما حقہ، لطف اندوز ہو سکے؟ وہ بھی چودہ پندرہ سال کی عمر میں۔ تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ استثنائی صورتوں سے قطع نظر اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔ اور یہ بات شاعری ہی نہیں قدیم نثر کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ تو کیا ثانوی نصاب سے شعر و ادب کی تعلیم کو خارج کر دیا جائے؟ نہیں یہ بھی غلط ہوگا۔ اس لیے کہ کسی زبان خاص کر مادری زبان کی تعلیم کا ایک اہم مقصد اس زبان کے شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے کا مذاق اور ملکہ پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔ تاہم یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ثانوی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبہ کی بڑی اکثریت کسی پیشے یا روزگار سے لگ کر عملی زندگی کے کارواں میں شامل ہو جاتی ہے اور وہاں سیکھی ہوئی زبان کا استعمال بیشتر روزمرہ کی عملی ضرورتوں میں ہوتا ہے مثلاً مراسلت، عرضی، درخواست

اخبار بینی، معمابازی، مذہبی یا پیشہ ورانہ کتابوں یا زیادہ سے زیادہ وقت گزاری کے لیے ہلکے پھلکے جاسوسی ناولوں اور نیم ادبی کتب و رسائل کا مطالعہ۔ زبان کی تعلیم کا ایک بڑا اور اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے خیالات اور اپنے مافی الضمیر کا اظہار آسانی اور روانی سے کر سکے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ثانوی سطح پر شعر و ادب کے مقابلے میں زبان کی تعلیم پر ہی زیادہ توجہ ہونی چاہیے اس طرح ثانوی سطح پر زبان و ادب کی تعلیم کے مقاصد کا تعین اس طرح کیا جا سکتا ہے:

الف: طلبا کے ذخیرۂ الفاظ اور زندہ محاورات کی آگہی میں وسعت پیدا کرنا۔

ب: طلبا کو زبان کے عملی اور ساختنیاتی ضابطوں سے روشناس کرانا۔ مثلاً تذکیر و تانیث، اضافت، سابقے، لاحقے وغیرہ۔

ج: مختلف طرح کی زبانی اور تحریری مشقوں کے ذریعے طلبا میں اظہار و بیان کی قوت کو وسعت دینا۔

د: طلبا میں اپنی شاعری اور نثری ادب سے لطف اندوز ہونے کا مذاق اور ملکہ پیدا کرنا (ظاہر ہے کہ یہ ادبی اور ذوقی تربیت بالکل ابتدائی ہوگی اور اس کے لیے کلاسیکی شعر و ادب کے سرمایے سے طلبا کو متعارف کرانا قطعاً ضروری نہیں ہوگا۔)

ھ: اردو شعر و ادب کی چند مقبول عام یا نمائندہ اصناف اور ان کی امتیازی خصوصیات سے متعارف کرانا۔

ثانوی سطح پر اردو کی تعلیم کے ان مقاصد کے حصول میں نصاب صرف ایک سہارا ہوتا ہے اصل کام تو استاد انجام دیتا ہے۔ یعنی اپنی ہدایت، وضاحت، ماحول آفرینی، سوال و جواب، بلند خوانی اور نوبہ نو مشقوں کے ذریعے اگر استاد کم سواد، غیر مستعد اور مجہول ہے تو اچھے سے اچھا نصاب بھی ان مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہوگا۔ نصاب کی تدوین کا انحصار اس پر بھی ہوگا کہ موجودہ ثانوی نظام تعلیم میں زبان کی تعلیم کو کتنا وقت یا کتنے گھنٹے الاٹ کیے جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل جب دہلی کے سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے دس جمع دو کے نظام کو اپنایا تو دوسرے مضامین کی طرح بورڈ نے ثانوی سطح کے اردو نصاب کی تدوین کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس کے ایک رکن کی حیثیت سے راقم الحروف بھی شامل تھا۔ اس کمیٹی نے

اپنے متعدد مشاورتی جلسوں میں مختلف زاویوں سے نئے نصاب کی ترتیب کے مسائل پر غور و خوض کیا اور چند رہنما اصول طے کیے۔ مثلاً یہ کہ نصاب میں قدیم کلاسیکی شاعری کے نمونوں کو شامل نہیں کیا جائے گا۔ یا مثلاً یہ کہ نئے نصاب میں ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کی ایسی تخلیقات کو فوقیت دی جائے گی جن میں عصر حاضر کی زندگی کے حقائق اور مسائل پیش کیے گئے ہوں۔ جن سے نوعمر طلبہ مانوس ہوتے ہیں۔ کمیٹی نے طے کیا کہ نصاب کے لیے شاعری اور نثر کے جو نمونے منتخب کیے جائیں وہ زیادہ مشکل اور دقیق نہ ہوں اور طلبہ کی ذہنی سطح سے مناسبت رکھتے ہوں۔ ہر نظم یا نثر پارے کی تحسین اور تفہیم کے لیے مختلف زاویوں سے مشقی سوالات دیے جائیں طلبا کو اردو شاعری کی انہی اصناف اور انہی شعری اور معنوی خوبیوں یا صفتوں سے روشناس کرایا جائے جو متن میں آئیں۔ نثر میں بھی اُن ہی نثری اصناف کی تعریف اور تفصیل بتائی جائے جو نصاب میں شامل ہوں۔ مثلاً افسانہ، تمثیل، انشائیہ اور خاکہ وغیرہ۔

ان اصولوں کی روشنی میں کمیٹی نے 'اردو نصاب' کے نام سے ایک نصاب ترتیب دیا جو بعد میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہو کر باقاعدہ شامل نصاب ہوا۔

اس انتخاب میں ایک دو استثنائی صورتوں کے علاوہ رہنما اصولوں کی پیروی کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ حصۂ نظم میں نظیر اکبرآبادی کی دو نظموں برسات کی بہاریں اور روٹی نامہ اور 'تلوار کی روانی' کے عنوان سے انیس کے چند بندوں کے علاوہ کسی کلاسیکی شاعر کا کلام شامل نہیں ہے۔ اس نصاب میں اقبال، جوش، مجاز، اختر الایمان، تاباں اور دوسرے ہم عصر شعرا کی جو نظمیں شامل ہیں ان میں نہ صرف موضوع بلکہ ہیئت اور تکنیک کے تنوع کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے یعنی کچھ نظمیں اگر مسدس اور مثنوی کے فارم میں ہیں تو کچھ غزل کے فارم میں اور کچھ میں مصرعوں کی ترتیب جدید انداز کی ہے۔ رباعیات اور قطعات کا ایک انتخاب بھی ہے۔ حصۂ نثر میں بھی سر سید کے مضمون 'بحث و تکرار' اور محمد حسین آزاد کے تمثیلی مضمون 'انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا' کے علاوہ سارے نثر پارے عہد جدید کی تحریروں پر مشتمل ہیں۔ ان میں پریم چند کا افسانہ 'گلی ڈنڈا'، پطرس اور کنھیا لال کپور کے مزاحیے 'کتے' اور 'دو کو لڑانا' شامل ہیں۔

یہ نصاب عام طور پر طلبہ اور اساتذہ میں پسند کیا گیا لیکن بورڈ نے جب نمبروں کی

تقسیم کے ساتھ دونوں پرچوں کے نصابِ تعلیم کی تفصیلات شائع کیں تو شاید کمیٹی کے کنوینر کی ہدایت پر کچھ ایسی چیزیں بھی شامل نصاب کر دی گئیں جو کمیٹی کی سفارشات کے منافی تھیں۔ مثلاً اصنافِ سخن میں قصیدہ، مرثیہ ترکیب بند، ترجیع بند اور مخمس اور صنائع شعری میں حسن تعلیل، مراۃ النظیر، صفت تضاد، صفت تجنیس، لف و نشر کے علم و آگہی کو ضروری قرار دیا گیا۔ جبکہ یہ اصناف اور یہ صنائع مرتبہ نصاب میں شامل نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ثانوی یا اعلیٰ ثانوی سطح کا کوئی نصاب اُس وقت تک جامع اور تسلی بخش طور پر مرتب نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ ابتدائی اور درمیانی درجوں کے نصاب سے مربوط نہ ہو۔ یعنی اولاً ضرورت اس کی ہے کہ پہلی سے آٹھویں جماعت تک کا Graded نصاب مرتب کیا جائے اور اس کی بنیاد جدید سائنٹفک اصولوں پر ہو۔ اس کے لیے زبان اور تعلیم کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں۔ یہ کام مہاراشٹر کے اسکولوں کے لیے وہاں کی ٹکسٹ بک کمیٹی نے بڑے سلیقے اور محنت سے انجام دیا ہے۔ یعنی ابتدا سے ثانوی سطح تک کی نصابی کتابیں مرتب کرا کے صحت اور خوبصورتی سے شائع کی ہیں۔ ان کی اس کمیٹی کے بیشتر ارکان اسکولوں کے تجربہ کار اردو اساتذہ ہیں۔ انھوں نے خود سبق تیار کیے اور اپنے لائحۂ عمل نیز ضرورت کے مطابق موضوعات دے کر ملک کے ممتاز اہل قلم سے سبق اور مضامین لکھوائے اور ان کا معقول معاوضہ بھی دیا۔ دہلی کے اسکولوں کے لیے یہ کام سنٹرل بورڈ اور اردو اکیڈمی کے باہمی اشتراک اور تعاون سے انجام دیا جا سکتا ہے۔

این۔سی۔ای۔آر۔ٹی کی کوشش یہ ہے کہ اردو کی ایسی درسی کتابیں شائع کی جائیں جو ہندوستان کے ہر علاقے کے اسکولوں میں رائج ہو سکیں۔ اس طرح کی یکسانیت بعض دوسرے سماجی اور سائنسی علوم میں حاصل کی جا سکتی ہے لیکن زبان اور اس کے ساتھ ادب بھی ہر علاقے کی مخصوص تہذیب، تاریخ اور جغرافیائی حالات کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ اردو، ہندی کی طرح ایک ایسی زبان ہے جو کسی ایک ریاست یا علاقے تک محدود نہیں۔ ملک کے ہر علاقے کی اپنی ایک تہذیبی اور معاشرتی شناخت ہے اس لیے ضروری ہے کہ مختلف ریاستوں کے اسکولوں میں اردو کی جو درسی کتابیں پڑھائی جائیں اُن میں اُس علاقے کی تہذیب و معاشرت کی بھی عکاسی ہو۔ مثلاً کشمیر کے بچے فطری طور پر

اپنی اردو کی درسی کتابوں میں اپنے علاقے کی معاشرت، جغرافیائی ماحول اور تاریخی آثار کی جھلکیاں دیکھنا چاہیں گے۔ اردو کے جو ادیب اُس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تخلیقات کو ثانوی اور اعلیٰ ثانوی نصاب میں جگہ ملنی چاہیے۔ مختلف ریاستوں کے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے اردو نصابات میں بھی اُس علاقے کی تہذیب اور تخلیقی جوہر کی نمائندگی کرنے والے ادب کو نمایاں جگہ دی گئی ہے اور اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

سنٹرل بورڈ دہلی کے جو درسی نصاب دہلی کے اسکولوں کے لیے ہوں گے ان کی نوعیت ان درسی نصابات سے کسی حد تک مختلف ہوگی جو آل انڈیا یعنی مرکزی اسکولوں میں رائج ہوں گے۔ یہ فرق نصاب کے کردار و معیار میں کیسا ہو اور کتنا ہو؟ اس کا فیصلہ ماہرین کی کمیٹی ہی کر سکے گی۔

الغرض ضرورت اس کی ہے کہ نئے تقاضوں اور نئی تعلیمی ضرورتوں کے تحت دہلی کے اسکولوں میں رائج سارے درسی نصابات کو ازسرِ نو ترتیب دیا جائے۔

اسلم پرویز

ثانوی درجات میں تاریخِ زبان و ادب کی تعلیم

اردو زبان جس مخصوص تہذیب کی آئینہ دار ہے اس کے سبب اردو زبان اور ادب دونوں کے معاملے میں ایک دلچسپ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم زبان اور ادب دونوں کو لازم و ملزوم سمجھ لیتے ہیں جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ادب کے لیے زبان یقیناً ضروری ہے لیکن زبان کا دار و مدار صرف ادب پر نہیں ہے۔ زبان، ادب کے ساتھ ساتھ اور بہت سے معاملات کے لیے بھی ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان انسانی سماج کے ہر فرد کی ضرورت ہے جب کہ ادب ہر انسان کی دلچسپی کی چیز نہیں۔ زبان ترسیل کا ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے مختلف لوگوں کے درمیان باہمی تعاون اور افہام و تفہیم کی صورت پیدا ہوتی ہے اور اس سے سماج آگے بڑھتا اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ترسیل کی ضرورت سبھی کو ہوتی ہے، مثلاً: مریض کو ہوتی ہے کہ وہ طبیب سے اپنا حال بیان کر سکے، بوڑھے باپ کو ہوتی ہے کہ وہ جوان بیٹے کو اپنا نقطۂ نظر سمجھا سکے، استاد کو ہوتی ہے کہ وہ اپنا مفہوم طالب علموں تک پہنچا سکے اور بالآخر ادیب یا شاعر کو بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی کیفیات کو ہم پر منکشف کر سکے۔ ترسیل کی ان چند ضروریات میں سے جن کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، ادب کا تعلق کچھ انسانوں سے اور بقیہ تمام کا سماج کے ہر انسان سے ہے۔ اس لیے زبان کی تاریخ کو صرف ادب کی تاریخ کے دیباچے یا پیش لفظ کے طور پر پڑھنا یا پڑھانا سائنٹیفک نہیں۔ ہمیں یہ مان کر نہیں چلنا چاہیے کہ زبان کی تاریخ میں دلچسپی صرف ادب کے طالب علم کو ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ زبان، ادب سے آزاد ایک علاحدہ ڈسپلن ہے اس لیے

زبان اور اس کی تاریخ کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے پڑھایا جانا چاہیے۔

اردو زبان اور ادب کی تاریخ اپنے آپ میں دو بڑے موضوعات ہیں اس لیے سیکنڈری اور سینیر سیکنڈری درجات کے لیے تاریخِ زبان اور تاریخِ ادب کی تعلیم کا پروگرام بناتے ہوئے ہمیں دو باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اردو زبان اور ادب کی تاریخ سے متعلق ہم کن چیزوں کو نصاب میں شامل کریں اور دوسرے یہ کہ ان کی تعلیم کا طریقۂ کار کیا ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کی تاریخ کی تعلیم کا کام سیکنڈری اور سینیر سیکنڈری درجات کی سطح پر علاحدہ علاحدہ ڈھنگ سے ہونا چاہیے یعنی طالبِ علم کو زبان اور ادب کی تاریخ کی تعلیم سیکنڈری درجات کی سطح پر بھی دی جائے اور سینیر سیکنڈری درجات کی سطح پر بھی، لیکن اس طرح کہ یہ تعلیم سلسلے وار نہ ہو بلکہ وہی موضوعات جن کا احاطہ سیکنڈری سطح پر کر لیا گیا ہے انھیں پھر ایک بار Qualitative Difference کے ساتھ سینیر سیکنڈری کی سطح پر پڑھایا جائے۔ اس طرح تاریخِ زبان و ادب کے تصورات آسانی سے طالبِ علم کے ذہن نشیں ہو جائیں گے اور اس کے دماغ پر زیادہ بوجھ بھی نہیں ہوگا۔ یہاں Qualitative DIFFERENCE سے مراد یہ ہے کہ سیکنڈری درجات کی سطح پر زبان اور ادب کی تاریخ کی تعلیم اِس طرح دی جائے کہ زبان اور ادب کی تاریخ سے متعلق باضابطہ اسباق تیار کرائے جائیں جو نصاب کی کتاب میں Text کے طور پر شامل ہوں تاکہ انھیں کلاس روم میں لفظ بہ لفظ پڑھا کر اُن اسباق سے متعلقہ مشقیں بھی کرائی جا سکیں۔ سینیر سیکنڈری کی سطح پر زبان اور ادب کی تاریخ ایک بار پھر کچھ زیادہ تفصیل اور کچھ زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑھائی جائے لیکن یہاں یہ موضوعات Text کا حصہ نہ ہوں بلکہ ان پر علاحدہ علاحدہ معاون کتب ہوں۔

سیکنڈری سطح پر اردو زبان کی تاریخ سے متعلق تین اسباق تیار کرائے جائیں جن کے موضوعات ہوں:

(i) زبان کی تعریف (ii) اردو زبان کی سماجی حیثیت اور (iii) اردو زبان کی تاریخ۔

زبان کی تعریف: اس سبق میں ہمیں اردو زبان کے بارے میں بات کرنے کے بجائے

مجموعی طور Language Phenomenon کے بارے میں طالب علم کے سامنے کچھ باتیں کھلنی ہونگی یعنی یہ کہ زبان کسے کہتے ہیں، زبان کی تشکیل میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں، کوئی زبان کس طرح وجود میں آتی ہے، زبان کی تاریخ کا مطالعہ کس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے، زبان کا تہذیب سے کیا تعلق ہے اور زبان اور رسم الخط کے باہمی رشتے کی کیا نوعیت ہے۔ زبان اور رسم الخط کے تعلق پر یہاں خاص طور پر زور دینے کی ضرورت اس لیے ہے کہ اردو رسم الخط کے عربی الاصل ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اردو زبان عربی یا فارسی سے نکلنے والی کوئی بیرونی زبان ہے۔ اس معاملے میں ہمارے طالبِ علم کا ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے۔

اردو زبان کی سماجی حیثیت: اس سبق میں ہمیں اردو کے ساتھ پیش آنے والی اُس سیاسی اور سماجی صورتِ حال کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا جو ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً: بعض حلقوں سے پیدا کی جانے والی یہ غلط فہمیاں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے یا یہ صورتِ حال کہ اردو پورے پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان ہے اور یہ بھی کہ باوجود اس کے کہ اردو موجودہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں ہی پیدا ہوئی لیکن ابھی تک اسے اس کا جائز مقام نہیں مل سکا ہے۔ ان تمام معاملات کو اس سبق میں اتنے منطقی انداز میں پیش کیا جائے کہ نہ تو ہمارا طالبِ علم ہی کسی لسانی عصبیت کا شکار ہو اور نہ محکمۂ تعلیم ہی کو اس سبق کی منظوری دینے میں کوئی دشواری ہو۔

اردو زبان کی تاریخ: اس سبق میں زبان کی تاریخ کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا جائے مگر اس میں کم از کم یہ ضرور بتا دیا جائے کہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سبق میں اردو اور ہندی کے باہمی تعلق پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

اردو زبان کی تاریخ کی طرح اردو ادب کی تاریخ پر بھی تین اسباق تیار کرائے جائیں جن کے موضوعات ہوں: (i) ادب کیا ہے، (ii) اردو ادب کی تاریخ اور (iii) اصنافِ سخن۔

ادب کیا ہے: 'زبان کیا ہے' کی طرح اس سبق میں بھی اردو ادب کا کوئی ذکر نہ کیا جائے بلکہ صرف ادب کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ انسانی زندگی میں ادب کا کیا رول اور مقام ہے۔ ادب زندگی سے کس طرح متاثر ہوتا ہے اور کس طرح اس پر اثر انداز

ہوتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ : اس سبق میں اردو ادب کی تاریخ کو مختصراً مگر ایک زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کیا جائے تاکہ ادب کے مختلف ادوار کی خصوصیات، مختلف ادیبوں کے زمانے کا تصور اور اردو ادب کے عہد بہ عہد ارتقا کا ایک ہلکا سا خاکہ طالبِ علم کے سامنے آسکے۔

اصنافِ سخن : اس سبق میں اردو نثر اور نظم کی اہم اصناف کا تعارف کراتے ہوئے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ادب کی تاریخ کے کس کس عہد میں کون کون سی اصنافِ سخن کو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی مقبولیت کے تاریخی اور سماجی اسباب کیا تھے۔

سینیر سیکنڈری کی سطح پر اردو کی ان کتابوں کے علاوہ جو نصاب میں Text کے طور پر داخل ہوں گی، دو کتابیں معاون کتب کے طور پر رکھی جائیں جن میں ایک کتاب زبان کی تاریخ سے اور دوسری ادب کی تاریخ سے متعلق ہو۔ یہ دونوں کتابیں بالترتیب پروفیسر احتشام حسین کی کتاب 'اردو کی کہانی'، اور پروفیسر اعجاز حسین کی کتاب 'تاریخ ادبِ اردو' بھی ہو سکتی ہیں۔ تاہم نصاب میں داخل کرنے سے پہلے ایک کمیٹی کے ذریعے ان کتابوں کا جائزہ لے لیا جائے کہ آیا یہ دونوں کتابیں ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کلاس میں پڑھائے جانے والے نصاب میں ایسے اسباق شامل کیے جائیں جو تاریخ ادب کے مختلف ادوار اور ادب کی مختلف اصناف کی نمائندگی کرتے ہوں۔ ہر سبق سے پہلے مختصراً اس کے مصنف کا تعارف بھی کرا دیا جائے۔ اس تعارف میں مصنف کے سوانح بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا زمانہ بتا کر ادب میں اس کے مقام اور مرتبے پر کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

اس میٹریل کے علاوہ سیکنڈری اور سینیر سیکنڈری کی مجموعی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک اور معاون کتاب کی شدید ضرورت ہے۔ یعنی یہ کہ ایک چھوٹا سا لغت بھی تیار ہونا چاہیے۔ یہ لغت اردو کے عام لغات سے مختلف ہوگا جس کی حیثیت ایک گلاسری کی سی ہوگی۔ یہ گلاسری ان تمام کتابوں کا احاطہ کرے گی جو نصاب میں معاون کتب یا Text Books کے طور پر شامل ہوں گی۔ اس لغت میں الفاظ کے معنی، ان کا محلِ استعمال، ان کا صحیح تلفظ اور املا یہ سب بتایا جانا چاہیے۔ شعر و شاعری کے ضمن میں استعمال ہونے والے الفاظ کی

وضاحت بھی اس لغت میں بجا طور پر ہونی چاہیے۔ اس لغت کے آغاز میں ایک مختصر مگر جامع پیش لفظ بھی ہونا چاہیے جس میں لغت کی تعریف بیان کی جائے، لغت کی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے اور اردو کے اہم لغات کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کی جائے۔

نصاب کی کتابوں کے ذریعے کلاس روم کی رسمی تعلیم کے علاوہ طالب علموں کو اردو زبان اور ادب کی تاریخ کے تصورات سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ جہاں ممکن ہو وہاں آڈیو ویژول ایڈز کے ذریعے انھیں ایسے کیسٹ سنوائے جا سکتے ہیں یا ایسی ویڈیو فلمیں دکھائی جا سکتی ہیں جن سے اردو زبان اور ادب کی تاریخ کے گوشوں پر روشنی پڑتی ہو۔ زبان اور تہذیب کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے اس لیے اردو زبان کے تہذیبی ورثے سے بھی طالب علم کی کچھ نہ کچھ آگاہی ضروری ہے زبان اور ادب کی تاریخ کے معنی صرف ان کی کرونولاجی ہی نہیں ہے بلکہ ان کے بارے میں صحیح تہذیبی معلومات بھی ان کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ اسکول میں ادبی پروگراموں کا منعقد ہونا یا اسکول کے باہر منعقد ہونے والے ادبی پروگراموں میں طلبہ کی شرکت انھیں اپنے موضوع کو آسانی کے ساتھ، اور قدرے تیز رفتاری کے ساتھ بھی سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

اسکولوں کے اساتذہ عام طور پر اکیڈمیشین نہیں ہوتے اور ان کا اکیڈمیشین ہونا ضروری بھی نہیں۔ لیکن یہ بہرحال ضروری ہے کہ زبان اور ادب کی تاریخ کے معاملات کو طلبہ کے سامنے مربوط اور سائنٹفک ڈھنگ سے پیش کیا جائے۔ مثلاً تاریخ زبان کے بارے میں شاید اس وقت تک سائنٹفک ڈھنگ سے کچھ کہنا مشکل ہے جب تک کہ ہمارے اندر لسانی سوجھ بوجھ نہ ہو۔ اس کے لیے Linguistic Orientation کی ضرورت ہے۔ لہٰذا تاریخ زبان کا موضوع ایسے اساتذہ کو پڑھانے کے لیے دیا جائے جو اس طرح کا Orientation رکھتے ہوں۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود اردو اکیڈمی کی سطح پر اساتذہ کے لیے اس طرح کے Orientation پروگرام تیار کیے جائیں اور یہ Orientation پروگرام اس وقت تک جاری رہیں جب تک کہ ہمارا مجوزہ نصاب تیار نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ فی الحال ہمارے اسکولوں کے اساتذہ کے سامنے اس طرح کا کوئی میٹیریل نہیں ہے جس کے ذریعے وہ اپنے طلبہ کو زبان اور ادب کی تاریخ اس طرح پڑھا سکیں جس طرح ہم ان سے پڑھوانا چاہتے ہیں۔

سیدؔ ضمیر حسن دہلوی

سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری اسکول کے نصاب کی زبان کا تنقیدی مطالعہ

غالباً یہ ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ارمغانِ آصف کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے اجرا کی تقریب میں عالی جناب پنڈت جواہر لعل نہرو کو یونیورسٹی کے کنووکیشن ہال میں مدعو کیا گیا۔ شعبے کے صدر خواجہ احمد فاروقی نے مہمان خصوصی کا استقبال کرتے ہوئے ایک خطبہ پڑھا جس کی زبان شیریں، شگفتہ اور موقعے کی مناسبت سے قدرے مرصّع تھی۔ جب خطبہ تمام ہوا اور معزز مہمان سے چند کلمات ارشاد کرنے کی درخواست کی گئی تو موصوف خواجہ صاحب پر برس پڑے۔ ان کی تقریر کا لبِّ لباب یہ تھا کہ اردو کے اساتذہ اور اسکالر حضرات غیر ضروری طور پر نمودِ نثر نگاری کے لیے پرشکوہ الفاظ میں اظہارِ خیال کرنے کی سعیِ بے جا کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آزادی کی جدوجہد میں جب وہ ہندوستان کے دیہاتوں میں تشریف لے جاتے تھے تو ان کی زبان کی سلاست نے انھیں دیہاتیوں سے رابطہ قائم کرنے میں سہولت بہم پہنچائی تھی۔ چنانچہ مدّعا اس تقریر سے یہ مضمر ہوا کہ خواجہ صاحب کو بھی گویا ابلاغ کے پیشِ نظر محض زبان کی سلاست کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔ ہمارے سیاستدانوں کا رویّہ عام طور پر یہ رہا ہے کہ وہ کسی اہم شخصیت کے اقوال کو بغیر کسی انتقادی سوجھ بوجھ کے دہرانے کی سعادت سے محروم رہنا باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ ایسا ہی مذکورہ قول کے سلسلے میں کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو سی گراں مایہ زبان قریب قریب پاؤ صدی میں اپنی تین چوتھائی فرہنگ سے محروم ہوگئی۔ لوگ کہتے ہیں اردو بہت شیریں زبان ہے مگر شیرینی تو شاخِ نبات سے لے کر عسلِ مصفّٰی تک ہر میٹھی چیز کی صفت مشترک ہے۔ زبان کے گرد جو ابنِ آدم

کا انبوہ دکھائی دیتا ہے وہ صرف مٹھاس کا متلاشی نہیں، تحمّل، تفکّر، تدبّر اور توانائی کا متقاضی ہے۔ ہندوستان میں ایسی بہت سی بولیاں ہیں جن میں گیت گائے جاتے ہیں۔ نوٹنکیاں کی جاتی ہیں۔ اندر سبھائیں منعقد ہوتی ہیں لیکن علمی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ ایوانِ سیاست کے دوست نما دشمن خدا نخواستہ اردو کو بھی اس سطح پر تو نہیں لانا چاہتے؟ جس زبان میں بنیے کا کھاتا لکھا جاتا ہے اس زبان میں اقتصادی امور یا شماریات پر عالمانہ گفتگو نہیں کی جاسکتی، اس آفاقی سچائی کو یقیناً کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

جس زمانے تک یونیورسٹی آف دہلی میں کنووکیشن کی تقریب باقاعدہ منائی جاتی تھی اس میں وہ تمام رسمی جملے بصد اہتمام دہرائے جاتے تھے جو انگریز بہادر سے ہم نے بطور ورثہ پائے تھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت بھی ان کی تکرار ہوئی تھی جب سنہ ۱۹۶۲ء میں چین اور ہندوستان کے درمیان سرحدی تنازعہ چل رہا تھا۔ اس موقعے پر یہ بتانا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ پنڈت جی اس تقریب میں بھی بنفسِ نفیس موجود تھے۔

اردو میں ہر قسم کا کاروبار چلانے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہ حیدر آباد دکن کے تمام علمی و ادبی، قانونی اور سائنسی شعبوں میں بخوبی کام کر چکی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے وسیع انتظامیہ اور عدلیہ میں آج بھی اردو کا چلن عام ہے اور بیشتر امور ایسے ہیں جو اردو کا سہارا لیے بغیر انجام ہی نہیں دیے جاسکتے۔ اردو سے اجتناب کا افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ ہم انگریزی راج کا طوقِ غلامی ہنوز اپنی گردن سے نہ اتار سکے۔ سر سید احمد خاں نے لکھا ہے:

"کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم اس زبان میں نہ آگیا ہو جو اس ملک کی زبان ہے۔"

اکثر ماہرینِ تعلیم نے مادری زبان میں تعلیم دینے کی سفارش کی ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے مختلف حصوں میں علاقائی زبانوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم بہم پہنچانے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اردو اور ہندی کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ علاقائی اعتبار سے ان دونوں میں وہی قریبی تعلق ہے جو لسانی اعتبار سے ہے۔ اس قرابت داری کے خوش آیند نتائج کا احاطہ کرنے کے لیے تو کافی وقت درکار ہے البتہ خاندانی چپقلش کا نظارہ اتنا عام ہے کہ اسے زبانِ قلم سے دہرانے کی بھی چنداں

ضرورت نہیں ہے۔ جُلاہے کی ضد میں سجدے کرتے کرتے جناب سادات نے سر مبارک آستاں کی نذر کر دیا اور اب صرف نشانِ سجدہ باقی ہے۔ ادھر کچھ من چلے زم زم کے کنارے بیٹھے جامۂ احرام کے دھبے دھونے پر مصر ہیں۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، تو کو نہ مو کو چولھے میں جھونکو۔ ہندی والے تو عاقبت سدھار لیں گے کہ ان کے پاس خدا رکھے وسائل ہیں مگر جناب ہمارا کیا ہوگا۔ ہم زبان کے چکر میں کہیں محفلِ علم و ادب سے نہ اٹھا دیے جائیں۔ اب بھی اگر آپ اردو میں شعر کہیں غزل گائیں، ڈراما کریں تو مستحسن ہے لیکن اگر موضوعِ سخن نباتات، حیاتیات، ارضیات، عمرانیات معاشیات، اقتصادیات ہو تو سامعین کہاں سے لائیے گا۔ وہ جو مثل مشہور ہے کہ مسلمان در گور اور مسلمانی در کتاب، وہ اردو پر اصل ہو رہی ہے۔ ترقی اردو بورڈ علوم صحیحہ اور علوم منقولہ میں کتنی ہی اصطلاحات وضع کر لے انھیں بولنے اور سمجھنے والے کہاں سے پیدا کرے گا۔ زبان میں سب سے زیادہ اہمیت استعمال کی ہے۔ جو الفاظ صرف کتابوں کے صفحات پر جلوہ نما ہوتے ہیں ان کی عمر کوتاہ ہوتی ہے۔ طرّہ یہ ہے کہ اردو کے طلباء اردو نصاب کو طغرے کی طرح سجا لیتے ہیں اور پڑھنے کی زبان وہی سست بیجھڑی ہے جو آج کل زندگی کے تمام شعبوں میں رائج ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کے اصولوں کی کارفرمائی کہیں دیکھنی ہو تو وہ اردو اور بولی جانے والی ہندی زبان میں دیکھیے۔ پرائمری اسکول سے فارغ ہونے والے بچّوں کی زبان کا تانتا ابھی نہیں ٹوٹتا کہ ان پر غیر ملکی زبان کا جوا لاد دیا جاتا ہے۔ جب ہم کسی دوسری زبان کو ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی زبان واجبی حد تک آتی ہو۔ لیجیے صاحب یک نہ شد دو شُد۔ اردو تو آتی نہ تھی انگریزی بھی اس ناواقفیت کی نذر ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو دنیا تھی، بند ہوئی افسانہ تھا۔ صاحبزادے خیر و عافیت سے ابتدائی اور درمیانی درجے طے کر کے ثانوی تعلیم کے میدان میں اتر گئے۔ ذرا ان سے پوچھیے تو سہی۔ حقیقی عدد کسے کہتے ہیں۔ ناطقی قوت کا مطلب کیا ہے۔ متبادلہ، متقابلہ، تسلسلات مساوات اور عشری پھیلاؤ سے جناب کا سابقہ پڑا ہے۔ کمی ارضیات کے لامتناہی سلسلے دیکھے ہیں۔ ریاضیاتی استقراء کا اصول معلوم ہے۔ حضور والا سائنسی نتائج اخذ کرنے کے سلسلے میں استنباط کے طریقے سے کیا مراد ہے۔ علم ہندسہ کے کلیدی تصوّرات کا نام سنا ہے، افقی قطعے اور عمودی قطعے کا فرق جانتے ہیں۔ کششی سیلان اور مخالف سیلان کا تعلق کونسی شے ہے۔

پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے کا ذکر چھوڑیے، یہ بتایئے اطرافی، ظہری، بطنی پتیاں کبھی اور کدھر ہوتی ہیں۔ مخ بچے کا نام تو اردو شاعری کے وسیلے سے گوش گزار ہوا ہوگا کبھی ایسے مسعار چے کی زیارت بھی نصیب ہوئی جس میں بغیر ڈنڈی کے پھول عمودی ساخت کے ساتھ ذوصفین لگے ہوں ضرب، مقسوم علیہ، ارکانِ تسلسل، کبھی مساوتیں، زاویہ، منفرجہ، معکوس، مثلثین منطبق کونسی زبان کے الفاظ ہیں۔ یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ اردو میں ثانوی تعلیم کی بنیاد انھی مذکورہ عناصر پر استوار ہوگی اور یہ کہ اہرامِ مصر جیسا کارنامہ ہم اپنے نحیف ہاتھوں سے کبھی نہ کر پائیں گے۔

اکابرین کا مشورہ یہ ہے کہ ہم اردو کو پچیس تیس فیصدی عربی اور فارسی لغات سے پاک کریں۔ بجا ارشاد ہوا پھر علمی مباحث کی اصطلاحیں کہاں سے لائیں؟ میرا کے گیتوں سے، نام دیو کے بھجنوں سے، کبیر کے دوہوں سے یا ان عوامی بولیوں سے جن کی ہر قابلِ قبول ادا کو اردو زبان نے اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ پولیس کے محکمے میں آمد اور روانگی آج بھی دیوناگری رسم الخط میں باندازِ قدیم درج کی جاتی ہے، عدلیہ کی اکثر بحثوں میں اردو کے معتوب الفاظ کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے مگر شعبۂ تعلیم میں جہاں الفاظ کی در و بست کا سلیقہ باقاعدہ سکھایا جانا چاہیے اور ان کے مصادر کی نشاندہی کی جانی چاہیے وہاں اردو نصاب کے نام پر سائنس انگریزی میں، سماجی علوم ہندی میں اور ادبیات ریختہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ منافقت کی اس سے زیادہ افسوسناک مثال بھلا اور کیا ہوسکتی ہے؟ میں خود اردو زبان کا طالب علم ہوں اور میں نے انٹرمیڈیٹ تک انگریزی میں سائنس بھی پڑھی ہے لیکن اگر آج مجھے سائنس کا مندرجۂ ذیل سوال حل کرنے کے لیے دیا جائے تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔ سوال ملاحظہ فرمایئے۔

ایک طبعی نظام میں ایک نیم سرایت جھلی کے ذریعے پانی کا نفوذ بدلتے ہوئے درجۂ حرارت پر سالمات کی بدلتی ہوئی تعداد کے ساتھ کیا ہوگا، بحث کیجیے۔ ریڈیوٹریسر کی جگہ تابکار شناسندے، انسولیشن کے بجائے برقی محجوزیت، چین ری ایکشن کے لیے زنجیری تعامل، تعدیل یعنی ماڈریشن چند ایسی مثالیں ہیں جن کا ذکر کتابوں میں تو دیکھنے کو ملا لیکن یقین کیجیے کہ عمرِ عزیز کی نصف صدی میں ان الفاظ کی سماعت سے کان کبھی گنہگار نہ ہوئے گویا یہ شوکیس میں لگائے جانے والے ایسے ماڈل

ہیں، جو کبھی فروخت نہیں کیے جاتے اور جن کے سبب سے کاروبار شوق بخیر و خوبی چلتا رہتا ہے۔ اردو کے ذریعے سائنس پڑھانے والے متعدد اساتذہ سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے ان شجرہائے ممنوعہ کو چھوئے بغیر طلبا کو فردوس گم شدہ کی سیر کرائی ہے۔ چلتے چلتے سائنس کے چند اصول جناب کے گوش گذار کرتا ہوں کہ سند رہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔

"کسی موصل کی برقی ایصالیت اس کی مزاحمت کی مقلوب ہوتی ہے۔" "توانائی تغیر عمل انگیز یدہ اور غیر عمل انگیز یدہ دونوں تعاملوں میں ایک جیسا ہی ہے۔" "عمل انگیز کی موجودگی میں پیش اور پس تعاملوں کی عامل کاری توانائی ایک ہی مقدار سے کم ہوتی ہے۔"

"ریڈیو خبر رسانی میں یہ لازمی ہے کہ اہتزازی توانائی کا فراج ایک عرصے تک یکساں رہے۔"

مختصراً عرض یہ کرنا ہے کہ اردو زبان کا جس نہج پر آزادی کے بعد فروغ ہوا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ اردو ایک تفریحی زبان بن گئی۔ علمی اصطلاحات اور لغاتِ فن مروّجہ زبان کا حصہ نہ بن سکیں۔ اگر کوئی بدنصیب طالبِ علم کسی یادگارِ زمانہ استاد سے باضابطہ اردو زبان میں علم سائنس، ہیئت اور ریاضی کا اکتساب کرے تو اسے درس و تدریس کے لیے آئندہ جنّاتوں کی دنیا میں ہجرت کرنی پڑے گی۔ تجربے سے ثابت ہے کہ دو اردو والے اگر بالمشافہ گفتگو کرتے ہوں تو خفیہ تفتیش کا محکمہ، عام طور پر یہ سمجھتا ہے کہ کوڈ ورڈس میں بات چیت کی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں کون عافیت کا دشمن اور عقل کا نابینا ہوگا کہ کسی دشمن کو یہ صلاح دے کہ وہ کتابوں میں درج اردو نصاب کے ذریعے تعلیم حاصل کرکے داخلِ عذابِ دارین ہو اور ہم چشموں کے بیچ ہدف مذاق و ملامت بنے۔

آئیے کچھ گفتگو سماجی علوم کے ضمن میں بھی کرلی جائے۔ تاریخ کے مطالعے میں دشواریاں کم پیش آتی ہیں۔ بندوبست اِستمراری، الحاقِ اودھ، ترکِ موالات جیسے کچھ لفظ درمیان میں آتے ہیں سو انھیں سمجھایا جاسکتا ہے۔ باقی منزلیں ہندوستانی میں طے کی جاتی ہیں۔ سیاسیات کی لغت رواں کرنے کے لیے کئی ہزار چھوٹے اخبارات ہیں۔ گندی بستیوں کے چائے خانے ہیں۔ روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں چسپاں کیے جانے والے دیواروں کے پوسٹر ہیں۔ اس پر بھی ریاست، اقتدارِ اعلا، وفاق، دستور، مقننہ اور مسابقتی قیام جیسے الفاظ اپنے مفاہیم ادا کرنے کی قوت کھو چکے ہیں۔ جغرافیہ میں

پھر وہی دقت پیش آتی ہے۔ سطح مرتفع، طول البلد، علاقائی قلبِ ماہیت، سخرہ دانی، ہبوطِ ارضی، متلونہ، آدیا بائی تبرید، مطیرو طبق، تبخیر و کثیف، مدّ اصغر، مدّ اکبر، تحت البحری منبت اور متعدد خلئی ساخت جیسے الفاظ ترسیل کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ الفاظ سمجھے ہی نہیں جاسکتے یا ان کا استعمال کرنا مشکل ہے۔ پچاس ساٹھ برس پہلے عام طور پر یہ علمی گفتگو کا حصہ ہوتے تھے مگر فی الحال نامانوس ہیں، غریب اور عام بول چال میں متروک ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے لیکن مادری زبان کا گردوپیش کے ماحول میں پایا جانا بھی ضروری ہے۔ اس وقت اردو نسل کا حال یہ ہے کہ بچہ جو زبان گھر میں بولتا ہے، ماحول کی زبان اس سے مختلف ہے اور اسکول کی زبان اگر مذکورہ بالا اردو ہوجائے تو اس کا دماغی توازن بگڑنے کا شدید اندیشہ لاحق ہوگا۔ شکر کی بات ہے کہ مڈل اور ثانوی اسکول کے اساتذہ اپنی معلوماتِ عامہ سے زیادہ اور نصاب کی کتابوں سے کم کام لیتے ہیں۔ یہ کتابیں ڈومنی کی ڈولی کی طرح تاخیر کے ساتھ تیار ہو کر جب اسکول پہنچتی ہیں تو لائبریری کے میوزیم میں سجادی جاتی ہیں۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ، سرکار سے مالی امداد ملتی ہے، اردو کے فاضل احباب کا صیغۂ روزگار ہے، دستوری اعتبار سے ایک فرقے کے تہذیبی تشخص کی قانونی ضمانت حاصل ہوگئی اور کیا چاہیے، اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے۔ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی

ایک طرف انگریزوں کے نمک پروردے ہیں۔ وہ اردو یا ہندی ذریعۂ تعلیم کے جھگڑے میں ہی نہیں پڑتے۔ بچّے کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہی تعلیم دلاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ صاحبِ فکر اور صاحبِ رائے نہیں ہوگا لیکن ایک حکمراں زبان کی چھتر چھایا میں پل کر کم از کم اس میں خود اعتمادی تو ہوگی۔ اس خود اعتمادی کے ذریعے انتظامی امور کی ذمّے داریاں اسی کے حصّے میں آتی ہیں۔ لارڈ میکالے نے برطانوی پارلیمنٹ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ وہ ہندوستان میں ایسا تعلیمی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں جو صرف انگریز حکام کے لیے کلرک پیدا کرے۔ کچھ عرصے پہلے ایک صاحب اعلا تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ تعلیمی سال شروع ہو چکا ہے اور اب انھیں قریب قریب چھ سات مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ انھوں نے سوچا اتنے عرصے کچھ عام مطالعہ کرلیا جائے

اس لیے ارباب جامعہ سے درخواست کی کہ وہ اتنی مدت کے لیے کچھ کتابیں تجویز کر دیں۔ انھوں نے معذرت چاہی اور صرف اتنا کہا کہ آپ جو کچھ ابھی تک پڑھ چکے ہیں، ان دنوں اسے بھلانے کی کوشش کیجیے۔ ہمارا تعلیمی نظام بھی اردو، انگریزی ہندی تینوں زبانوں میں کچھ اس طرح چلتا ہے کہ ذہن خلط المباحث کا شکار ہو کے رہ جاتا ہے اور اس میدانِ کارزار سے کوئی جیتا لوٹ آئے یعنی اعلا تعلیم کی منزل تک پہنچے تو کم از کم تلافیِ مافات کے طور پر ذہن شوئی کے عمل سے گذرنا ضروری ہے۔ اردو ہندی کے سیاسی جھگڑے کی قربان گاہ پر نئی نسل بھینٹ چڑھا دی گئی۔ ذرا اس درمیانی پیڑھی کو اٹھ جانے دیجیے مریضِ عشق کے لیے اپنا حال بتانا دشوار ہوگا۔ زبان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے اور زبان کا جو حشر ہو رہا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ نئی نسل کے جو لوگ اکتسابی شعور رکھتے ہیں اُن کی رسائی تار پود تک نہیں ہے اس لیے جو کچھ وجود میں آتا ہے باد ہوائی ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہندی کی خانہ جنگی ختم کرائی جائے۔ سارے ملک کی ایک ہمہ گیر زبان ہو، لسانی عصبیت سے بالاتر ہو کر مناسب اصطلاحات وضع کی جائیں، ابلاغ کے جدید وسیلوں سے اُن کا چرچا عام کیا جائے گھر، ماحول اور اسکول کی زبان میں مناسب ربط ہو پھر دیکھیے کہ تعلیم سے تخلیقی قوتوں کو بھرپور اظہار کا موقع ملتا ہے یا نہیں۔ اردو اور ہندی کے درمیان سیاسی حرم کے پاسبانوں نے جو مصنوعی حدیں کھینچ رکھی ہیں ان کی موجودگی میں ہماری مادری زبان ذریعۂ تعلیم کے منصب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اردو کو کسی علاقائی زبان کی حیثیت سے منصفانہ ترقی کا موقع ملے اور ابتدائی، درمیانی، ثانوی تعلیم سے لے کر اعلا تعلیم تک سارے مراحل اسی زبان میں طے کیے جائیں۔ درمیان میں کسی مناسب منزل پر طلبا دوسری زبان کی حیثیت سے ہندی اور انگریزی سیکھ کر ملک کے داخلی ماحول اور عالمی برادری سے ایک صحت مند رابطہ قائم کریں تاکہ عصری شعور اور جدید آگہی کے میدان میں پیچھے رہ جانے کا خدشہ لاحق نہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت کرنی ضروری ہے کہ اردو رسم الخط کے بغیر اردو زبان کا تصور ممکن نہیں۔ اردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث میں یہی ایک خطرناک موڑ آتا ہے۔ رسم الخط کے معاملے میں اردو والے جذباتی ہیں نہ ضدی، فقط ایک ہزار سال کے اندوختے کا خیال ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق انڈیا آفس لائبریری میں اردو رسم الخط کا اتنا مواد موجود ہے کہ اگر ایک جدید کیمرے سے اس کی مائیکرو فلم تیار کی جائے تو اس کام کے لیے چار سو برس سے زیادہ کی مدت درکار ہوگی۔

سید غلام حیدر

پرائمری اور مڈل اسکول کی سطح پر معاون نصاب مواد اور اس کی ضرورتیں

ابھی چند سال پہلے جامعہ کے ہائر سکنڈری اسکول میں طالب علموں کا ایک مباحثہ ہو رہا تھا جس میں مقررین اپنی رٹی ہوئی تقریروں کو اتنی اچھی اداکاری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے وہ فی البدیہہ بول رہے ہوں۔ مباحثے کا موضوع اقبال کا ایک مصرعہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" تھا۔ دہلی کے کسی اسکول کے طالب علم نے دورانِ تقریر پوری روانی سے دُہرایا: "قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے"۔ تین بار مسلسل نیچے سے ٹوکے جانے کے بعد بھی فاضل مقرر نے اِس دخل در معقولات کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور بڑی محنت سے رٹی ہوئی تقریر کو "مرگِ یزید" کے ساتھ پورا کرنے میں مصروف رہے۔ کچھ زیادہ حساس قسم کے سامعین لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ورد کرتے ہوئے ہال سے باہر نکل آئے۔ آپ یقین کیجیے کہ اِس سانحے کے بیان میں زیبِ داستان کے لیے ایک لفظ بھی نہیں بڑھایا گیا ہے۔

ایک دوسرے نوجوان کی، تاریخ اور اپنے مضمون کے علاوہ دوسری چیزوں میں دلچسپی کے محدود ہونے کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔ یہ پڑوسی ملک کے ایک ہونہار طالب علم کا ذکر ہے جو میکینکل انجینیرنگ کا ڈپلوما حاصل کرکے اِدھر آئے تھے۔ جتنے دن بھی وہ اِدھر رہے اُن کا فلمیں دیکھنے کا اوسط ماشاءاللہ روزانہ ایک سے زیادہ ہی رہا ہوگا۔ میں نے اپنی بزرگانہ ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے چھٹی لے کر ایک دن اُنھیں دہلی دکھانے کا پروگرام بنایا۔ حوض خاص کے کھنڈر دیکھ کر جب ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو مجھے کچھ جھٹکا سا لگا۔ مگر میں نے سوچا کہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو اِس کی تاریخی اہمیت کا

احساس ہو۔ ہماری اگلی منزل قطب مینار تھی۔ وہ لان میں گھومتے رہے، علائی دروازہ، مسجد قوت الاسلام، لوہے کی لاٹ، قطب مینار، سب کچھ دیکھا مگر اُن کے منھ سے ایک لفظ بھی قطب مینار کے بارے میں نہ نکلا۔ آخر جب مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے پوچھا کہ 'میاں تمھاری طرف اتنے عظیم الشان اور اتنے اونچے مینار کیا ہر گلی کوچے میں ہیں کہ جنھیں دیکھتے دیکھتے تم عادی ہو چکے ہو'، تو انھوں نے فرمایا کہ مینار تو خیر نہیں مگر کارخانوں کی چمنیاں تو اس سے اونچی اونچی اُن کے شہر میں نظر آجاتی ہیں۔ اور پھر مجھے خیال آیا کہ جب گھر میں V.C.R. اور شہر میں ان گنت سینما ہال موجود ہیں تو 'معاونِ نصاب' تو دور کی بات ہے 'نصاب' پڑھنے کے لیے ہی کہاں وقت ہوتا ہوگا۔

اِن مثالوں کے بعد — جن کی کڑواہٹ ہوسکتا ہے کچھ دیر آپ کے منھ کا مزہ خراب رکھے ہیں اپنی اس تحریر کے بارے میں کچھ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مقالہ نویسی کے فن سے میرا دور کا بھی کوئی رشتہ نہیں ہے۔ موجودہ تحریر میں نہ بہت سی گتھیاں ہیں نہ اُن کے حل، نہ اقتباسات نہ حوالے، حد یہ ہے کہ مقالے کی روح یعنی کوئی انوکھی Controversy کھڑی کر دینا — اس کی بھی اِس بے ضرر تحریر سے مجھے امید نہیں ہے۔ میں خود ایک دفتری پرزہ ہوں اور اپنی زندگی کے معمولات میں سے کچھ وقت چرا کر بچّوں کے لیے کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ بچّوں کے ادب کو اردو میں ابھی ادب کی مصدقہ صنف بھی نہیں مانا جاتا۔ بچّوں کے لیے لکھنے والے کو اپنی تحریر میں سے مشکل الفاظ، خیالات، بندشیں، اصطلاحات، تشبیہہ و استعارات چُن چُن کر نکال دینے کی عادت سی بنانی پڑتی ہے۔ اور جب یہ سب کچھ نہ ہو تو مقالہ کیا۔؟ بہرحال اگر مضمون اور مقالے میں کوئی فرق کیا جاتا ہے تو میں اپنی اس تحریر کو زیادہ سے زیادہ ایک مضمون کی جگہ دوں گا۔ رہا اصطلاحوں کا مسئلہ تو معاونِ نصاب مواد، غیر نصابی مواد، امدادی نصاب، یا اگر کوئی اور ایسی اصطلاح موجود ہو تو میں نے اِس مضمون میں آگے 'معاونِ نصاب مواد' سے ہی ظاہر کیا ہے۔ غالباً آسان سی بات یہ ہوگی کہ وہ ساری کتابیں مضامین، مشاہدے، تجربے، وغیرہ وغیرہ جن کی مختلف جماعتوں میں باقاعدہ تعلیم یا تربیت دی جاتی ہے، اور پھر کسی نہ کسی شکل میں اس مواد سے امتحان بھی لیا جاتا ہے، وہ نصابی مواد ہے اور اِس کے علاوہ جو مواد بھی بچہ اپنے شوق سے یا کسی بیرونی ترغیب پر پڑھتا ہے، دیکھتا یا سنتا ہے اُسے ہم 'معاونِ نصاب' کہہ سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جس طرح اب خود نصابی تعلیم بھی صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ اسی طرح 'معاونِ نصاب مواد' میں بھی کتابوں کے علاوہ رسالے، فلم، ریڈیو، ٹی۔وی پروگرام، ڈرامے اور ایسے سارے ذرائع شامل ہیں۔ لیکن اِس مضمون میں زیادہ تر کتابوں کے میڈیم کو ہی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ بہرحال اس سے دوسرے ذریعوں کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی بلکہ آج کل ان کی اہمیت بڑھتی ہی جارہی ہے۔

میں نے موضوع پر اپنے اظہارِ خیال کو چار حصّوں میں بانٹا ہے۔ پہلا، 'معاونِ نصاب مواد کی اہمیت'، دوسرا۔ معاونِ نصاب مواد' تیسرا۔ پرائمری اور مڈل اسکول کی سطح تک معاونِ نصاب مواد کی ضرورتیں۔ اور چوتھا موجودہ صورتِ حال۔ اور آخر میں کچھ تجاویز۔ میں جانتا ہوں کہ میرے سامنے جو حضرات موجود ہیں وہ اِن موضوعات پر مجھ سے کچھ بہتر ہی جانتے ہیں۔ اس سے میرا کام کچھ آسان بھی ہوگیا ہے اور مشکل بھی۔ بہرطور کچھ ایسی باتیں جنھیں میں اہم سمجھتا ہوں آپ کے سامنے یاد دہانی کے طور پر پیش کیے دیتا ہوں۔ یہ بات بھی اِسی موقعے پر واضح کردوں کہ میں نے جو کچھ عرض کرنے کی کوشش کی ہے اُس میں صرف موجودہ نظامِ تعلیم کو پیشِ نگاہ رکھا ہے۔

مُعاونِ نصاب مواد کی اہمیت

اِس طرف ایک خفیف سا اشارہ تو آپ بالکل شروع میں ہی سُن چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نصاب کی کچھ روایتی اور بہت حد تک شاید لازمی پابندیاں ایسی ہوتی ہیں کہ اُس میں موضوعات کو بچوں کے سامنے بہت محدود انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ بچّوں کی عمر، علمی استعداد، اور موضوع سے دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی سبق میں پڑھائے جانے والے متن میں صرف اتنا ہی مواد پیش کیا جائے جو جماعت میں اوسط سے نیچے طالب علم کی استعداد سے آگے نہ بڑھے۔ پھر خواہ کوئی بھی مضمون ہو — محض زبان کی تعلیم ہو یا تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور ریاضی ہو — پورے سال کے دوران ایک مقررہ نصاب پورا کیا جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جامعہ میں کافی پہلے 'پروجیکٹ' طریقۂ تعلیم کے ذریعے بعض موضوعات کو بڑے دلچسپ انداز میں مڈل اسکول بلکہ پرائمری کی حد تک کافی وسعت کے ساتھ پڑھانے کا تجربہ بھی کیا گیا تھا۔ بس اس سلسلے میں ماہرینِ تعلیم کی رائے پر

بحث کرنے کی صلاحیت تو اپنے اندر نہیں پاتا لیکن چونکہ چھٹی جماعت تک ایسے کچھ پروجیکٹوں میں میں نے خود بھی حصہ لیا تھا اس لیے اُس کی افادیت کو آج ضرور محسوس کرتا ہوں۔ بہر حال اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ پروجیکٹ طریقۂ تعلیم سے معاونِ نصاب مواد کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری ابتدائی اور مڈل جماعتوں میں جب کسی موضوع پر کوئی سبق پڑھایا جاتا ہے تو اگر وہ فی الحقیقت دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہو اور اگر اُسے اتنے ہی دلچسپ انداز میں پڑھایا بھی جائے تو یہ سبق بچّے کے ذہن میں اُس موضوع میں دلچسپی اور مزید کچھ جاننے کے لیے ایک تجسس پیدا کر سکتا ہے۔ مگر میں توجہ دلاؤں کہ اس جملے میں دو جگہ 'اگر' اور ایک جگہ 'فی الحقیقت' کی شرطیں موجود ہیں۔ بہر حال یوں بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف موضوعات میں بچّے کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے اس تجسس کو بیدار کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ ایک متوازن ذہنی نشو و نما کے لیے معلومات میں وسعت اور تنوع لازمی ہے۔

میں نے ایک واقعہ خواجہ غلام السیدین مرحوم سے منسوب سُنا ہے۔ اگر میں اسے اِن کی ذات سے منسوب کرنے میں کوئی غلطی کر رہا ہوں تو میں اِس کی تصحیح کو شکریے کے ساتھ قبول کروں گا۔ سُنا ہے کہ وہ کسی سفر میں اردو جاننے والے ایک طالبِ علم کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ اردو جاننے والے حضرات کی عادت کے مطابق انھوں نے بھی اپنے پسندیدہ شاعر اقبالؔ کا کوئی سیدھا سادا سا شعر پڑھا اور پوچھا کہ 'میاں سمجھے'! طالبِ علم کا جواب تھا 'میں سائنس کا طالبِ علم ہوں'! اِس پر سنا ہے کہ انھوں نے کہا کہ 'پھر تو آرٹس کا طالبِ علم یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ سانس کے ساتھ آکسیجن پھیپھڑوں میں لے جاتا ہے یا کاربن ڈائی آکسائڈ'!

حقیقی ضرورت یہ ہے کہ طالبِ علم اعلا تعلیم میں خواہ کوئی بھی شاخ چنے اُسے اپنی مخصوص شاخ کے علاوہ دوسری شاخوں کی بنیادی معلومات بھی ہونی چاہییے اور اُن سے دلچسپی بھی۔ آج تخصیص کے دور کی کمزوریوں کے پیشِ نظر اس چیز کی ضرورت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تعلیم کی ہر سطح پر عام معلومات پر کافی زور دیا جانے لگا ہے۔

ظاہر ہے کہ اِن ضرورتوں کو نصاب میں پڑھائے جانے والے چند مضامین پورا نہیں کر سکتے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک بچے کو شروع سے ہی اِس قسم کا دلچسپ اور مفید مواد مہیّا نہیں کیا جائے گا

اور اُسے ایسا مواد پڑھتے رہنے کی عادت نہیں ہو گی کسی اگلی اسٹیج پر نہ اُس میں ایک دم یہ شوق پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس اونچے درجے پر وہ ابتدائی معلومات اُسے اتنی دلچسپ محسوس ہوں گی جتنی ابتدائی درجوں میں ہو سکتی تھیں۔

معاونِ نصاب مواد

ایک بار پھر دہرا دوں کہ اِس مواد میں کتابوں اور رسالوں یا دوسرے لفظوں میں مطبوعہ مواد کے علاوہ تمام جدید طریقے شامل ہیں لیکن کتاب بہر حال اہم ترین حیثیت رکھتی ہے۔ اِسی کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ اِس مواد سے میری مراد صرف معلوماتی مضامین کی کتابیں نہیں ہیں۔ معاونِ نصاب مواد میں پریوں اور پری زادوں کی اور جانوروں کی کہانیوں سے لے کر موجودہ سماجی کہانیوں، بلکہ کسی حد تک جاسوسی کہانیوں، Adventure Stories سوانح وغیرہ تک سب کی اپنی اپنی اہمیت ہے بشرطیکہ اس مواد کو پورے شعور اور احتیاط کے ساتھ تیار کیا گیا ہو اور یہ بچوں کی دلچسپی کی آخری کسوٹی پر پورا اترے۔

معاونِ نصاب مواد کی ضرورتیں

اس حصے میں میں نے مختلف عمر کے بچّوں کے لیے جس قسم کے مواد یا اُس کی اصناف کی ضرورت ہوتی ہے اُس کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ریاضی کے کسی فارمولے کی طرح کوئی بھی اصول حتمی اور آخری تو نہیں کہا جا سکتا۔ ماہرینِ نفسیات خود عمر کی بھی بنیادی طور پر دو قسمیں کرتے ہیں۔ جسمانی عمر اور دماغی عمر۔ ان کی اس تقسیم سے بہت پہلے بھی یہی مانا جاتا تھا کہ 'بزرگی بہ عقل باشد نہ بہ سال' اور پھر آج کے معاشرے میں مختلف اقتصادی، سماجی، دیہی، شہری طبقوں سے تعلق رکھنے والے بچّوں کے شعور اور صلاحیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ شہری بچہ جمبو جیٹ، راکٹ، ایٹمی طاقت اور ہائیڈروجن بم کے ناموں سے واقف ہوتا ہے لیکن دور افتادہ دیہات کا اُسی عمر کا بچہ ہوائی جہاز کو بھی مشکل سے جانتا ہے۔

اس حقیقت سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا کہ بچے کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کا احساس، شعور،

تمیز Perception فہم و ادراک اور اُس کی وسعت یعنی Conception اور سب سے زیادہ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بچّوں کے ادب کے ماہرین نے بچّوں کو اُن کی عمر کے اعتبار سے مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کر کے اُن کی ضروریات یا مانگوں کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے:

۱۔ پانچ سال سے کم (عام طور پر باقاعدہ اسکولی تعلیم سے پہلے)
۲۔ پانچ سے آٹھ سال (عام طور پر پہلی سے تیسری چوتھی جماعت تک)
۳۔ آٹھ سے بارہ سال (عام طور پر تیسری چوتھی سے ساتویں آٹھویں جماعت تک)
۴۔ بارہ سے سولہ سال (عام طور سے ساتویں آٹھویں سے گیارھویں بارھویں جماعت تک)

میرے اس مضمون کا احاطہ حقیقت میں صرف درمیانی دو زمروں تک ہے جس میں عام طور پر مڈل درجے تک کے طالب علم آتے ہیں۔ بہر حال ہر زمرے کے لیے معاونِ نصاب مواد کی تیاری میں صنفِ ادب کے چناؤ سے لے کر موضوع، متن، معلومات کی مقدار، طرزِ بیان، جملوں کی ساخت، الفاظ کا استعمال وغیرہ ہر ایک پر پوری توجہ دینا ضروری ہے۔

۱۔ پانچ سال سے کم :- اِس گروپ کے لیے کوئی نصابی مواد متعین ہو یا نہ ہو' معاونِ نصاب مواد' بہر حال لازمی ہے اور ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں فراہم کیا جاتا رہا ہے۔ لوریوں کے میٹھے سریلے بولوں سے یہ غیر نصابی مواد شروع ہوتا ہے۔ نرسری کے گیتوں، چڑیا چڑے کی عالمگیر کہانی، جانوروں کے کرداروں پر مبنی خود ساختہ واقعات، پنچ تنتر کی، زبانی سنائی جانے والی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، اِن تمام غیر تحریری اصناف سے گزرتا ہوا یہ مواد اُن تصویری کہانیوں تک پہنچتا ہے جن میں الفاظ یا تو برائے نام ہوں یا بالکل ہی نہ ہوں، اور تصویریں بہت واضح، رنگین اور دلچسپ ہوں۔ جہاں تک اوّل الذکر قسموں کا تعلق ہے آج کے دور میں ہمارے بچّوں کی اِس بدنصیبی پر ضرور افسوس ہوتا ہے کہ اوپر کی پیڑھی کی معاشی تگ و دو میں وہ کافی حد تک اُن لذتوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو پچھلی نسلوں کو میسر تھیں۔ میرے خیال میں اِس مواد کی بچّوں کو ہمیشہ ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔ ہر لوک کہانی یا پریوں کی کہانی میں اس بات کا بار بار دہرایا جانا کہ برائی پر ہمیشہ اچھائی کی فتح ہوتی ہے' وہ اخلاقی ستون ہے جس پر اس دنیا کی سلامتی کی امید کی جا سکتی ہے۔ اور آخری قسم یعنی تصویری' یا پڑھ کر سنائی جانے والی کہانی تیار کرنے کے لیے بڑی تخئیل اور اس کی

ایک خاص طرح تربیت کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی کہانیوں کی کتابیں ہمارے بچوں کے پاس کم و بیش نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کبھی کسی بچّے کے ہاتھ میں کوئی ایسی کتاب نظر بھی آجاتی ہے تو عام طور پر وہ کسی غیر ملکی (خاص طور پر روسی) زبان کا چربہ ہوتی ہے۔

۲۔ پانچ سال سے آٹھ سال: ذہنی نشو و نما اور بالخصوص پڑھنے کی عادت پیدا کرنے کے لیے یہ عمر سب سے اہم تصور کی جا سکتی ہے۔ اس زُمرے کے درمیانی حصّے میں بچّے سیدھے سادے لفظ آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ ان کے تجسّس میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور سمجھ بوجھ بھی کسی قدر بڑھ جاتی ہے۔ جلی خط میں چھپی ہوئی کتاب کو اپنے پاس رکھنے، اُس سے کھیلنے، اور اس بات میں بچہ بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اس نے ایک کتاب پڑھ لی ہے۔

اِس عمر کے بچوں کو آسان لفظوں، سیدھے سادے پلاٹ کی کہانی، جلی طباعت اور خوبصورت تصویروں کے ساتھ کتاب دے کر ہم اُس کے شوق کی تسکین اور ذہنی نشو و نما دونوں کا سامان فراہم کر سکتے ہیں۔ اِسی سطح پر بے حد دلچسپ انداز میں معلوماتی مواد بھی بہت آہستہ آہستہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ جیسے تتلی، مینڈک، چڑیوں، گلہریوں، چیونٹیوں، شہد کی مکھیوں وغیرہ کی زندگی کے طریقے، مختلف ممالک کے بچّوں کے رہن سہن، اور اُن کے ممالک کے متعلق معلومات، بالکل ابتدائی سائنس، پیڑ پودوں کا تعارف، گرد و پیش کے ماحول کی کہانیاں، پیشہ وروں کے کاموں کی تفصیلات، نظم، نثر، چھوٹے ڈرامے، غرض سب کچھ انھیں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن بچّے کے تجسّس اور پڑھنے کے شوق کو ہم صرف اُسی صورت میں بروئے کار لا سکتے ہیں کہ جو مواد بھی ہم اُسے فراہم کریں وہ ظاہری اور باطنی طور پر اتنا خوبصورت ہو کہ وہ ایک بار اُسے اٹھا کر چھوڑ ہی نہ سکے۔ میرا خیال ہے کہ خوبصورت کیپسول کی تکنیک جسمانی علاج میں اِس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اگر کیپسول رنگ برنگا ہوگا تو بچہ آسانی سے اُسے کھانے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر اس عمر کے لیے 'کتابی کیپسول' تیار کرتے وقت اوپر نیچے اور شروع سے آخر تک خوبصورتی اور دلچسپی کا خول چڑھانا لازمی ہے۔

مکتبہ جامعہ نے بہت پہلے اِس عمر کے بچّوں کے لیے کافی اچھی کتابیں شائع کی تھیں اور اُس وقت کی لیتھو طباعت اور کافی لاگت کے باوجود یہ بچّوں کی اِس ضرورت کو کسی حد تک پورا بھی کرتی تھیں۔ ایک بدنصیب ادارہ کتابی دنیا لمیٹڈ جس کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات دونوں ۲۷ء میں

واقع ہوئیں، اِس نے کچھ بہت اچھی کتابیں چھپوائیں، جن میں سے کچھ اب بھی نظر آجاتی ہیں، یہ اِس سلسلے میں اگلا قدم تھا۔ مرحومہ بیگم قدسیہ زیدی نے بھی کچھ بہت اچھی کتابیں چھپوائی تھیں، جو جلی خط میں تھیں اور تصویروں کے اعتبار سے بھی کافی اچھی تھیں۔

بہرحال یہ زُمرہ جو پڑھنے کی عادت پیدا کرنے کے لیے بیج بونے کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، اِس کے لیے اردو ادب میں بحیثیتِ مجموعی نہ ہونے کے برابر کام ہوا ہے۔ اور جو کچھ ہوا بھی ہے اس میں بھی بنیادی اصولوں کو بہت کم مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

۳۔ آٹھ سے بارہ سال:۔ یہ درجہ اِس لحاظ سے اہم ترین ہے کہ غیر شعوری طور پر بچّوں کے مصنفین کے سامنے عام طور پر یہی زمرہ رہتا ہے۔ جو لکھنے والے شعوری طور پر اپنی تحریر کے پڑھنے والوں کی عمر کا تعین نہیں کرتے وہ حقیقت میں خود بخود اسی زمرے کے لیے لکھتے ہیں۔ بہرحال اس میں کچھ آسانیاں بھی ہیں۔ بچہ آسانی سے پڑھ سکتا ہے، ذخیرۂ الفاظ بھی عام بول چال کی حد تک اُس کے پاس موجود ہوتا ہے۔ تخئیل، سمجھ بوجھ، اور شعور میں بھی اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ نصابی تعلیم سے مختلف موضوعات کی بنیادی معلومات بھی حاصل ہو چکی ہوتی ہے اور کچھ موضوعات میں دلچسپی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ بچہ ابھی زیادہ سے زیادہ آٹھویں جماعت تک پہنچا ہوتا ہے اِس لیے اُس پر نصابی بوجھ بھی بہت زیادہ نہیں ہوتا اور اگر اُسے دلچسپ مواد دے دیا جائے تو وہ بے حد شوق سے پڑھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

اس عمر کے بچوں میں تحریری، مشاہداتی، یا تجرباتی، کسی بھی قسم کے غیر نصابی مواد میں اگر دلچسپی پیدا کر دی جائے تو وہ اُسے پڑھتے بھی ہیں، اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور مستفید بھی۔ یہی وہ عمر ہے جب بچّے ہر چھپی ہوئی چیز کو پڑھ جانا چاہتے ہیں اور ہر چھپے ہوئے لفظ کو آخری سند مانتے ہیں۔ بہرحال ابھی اُن کے شعور میں اتنی پختگی بھی نہیں ہوتی کہ اپنے لیے وہ مناسب اور نامناسب مواد میں تمیز کر سکیں۔ اور جہاں تک نامناسب مواد کا سوال ہے، آج کے دور میں ہمارے پڑھے لکھے گھروں میں اُس کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کلچر کے ترجمان فلم فیر، مادھوری، اسٹارڈسٹ اور ادب کے ترجمان شمع، شبستاں، روبی وغیرہ کے توسط سے یہ مواد عام گھروں میں پہنچتا رہتا ہے۔ اِس لیے جن بچّوں کو خوش نصیبی سے اپنے گھروں میں پڑھنے کے لیے کچھ مواد مل بھی جاتا ہے وہ بھی زیادہ تر اُن کے لیے

ناموزوں ہی ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک افسوسناک پہلو ہے کہ بچے کو اسکول کا کام کرنے اور گھر پر اپنی خوشی سے ڈرائنگ بنانے کے لیے تو کاغذ نہیں مل پاتا مگر منوں کاغذ فلموں کی گندی تصویروں، دواؤں کے اشتہاروں اور سیاسی ریشہ دوانیوں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے دیواروں پر چپکا دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اوّل تو ہمارے خانگی بجٹ میں کتاب یا رسالے خریدنے کے لیے عام طور پر ویسے ہی بہت کم گنجائش ہوتی ہے اور اگر کبھی کسی طرح اس مد پر کچھ خرچ بھی کیا جاتا ہے تو اس میں بچوں کے لیے کتابیں خریدنے کا سوال بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔

گذشتہ دو تین دہائیوں میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، اور تازہ طور پر ویڈیو کا بڑھتا ہوا رواج بچوں سے بڑی تیزی سے وقت چھینتا جا رہا ہے اور بچوں کے لیے غیر نصابی مواد تک پہنچنے کے مواقع اور بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔

بہرحال اس عمر کی مانگوں کو پورا کرنے کے لیے ہم انھیں ہر طرح کا غیر نصابی مواد دے سکتے ہیں۔ اگر لکھنے والے اپنے مواد میں دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں تو اس عمر کے بچوں کو کم و بیش ہر موضوع پر مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ بچوں یا بڑوں کی تحریک Action سے بھرپور کہانیاں، محیر العقول کہانیاں Fantasies سماجی، تاریخی، سائنسی، ایڈونچر کہانیاں، اسپورٹس، مہموں کے بیانات (پہاڑی، بحری، ریگستانی مہمیں)، جنگوں کے حالات، ایجاد و اختراعات کے قصے، سماجی، سائنسی معلوماتی کہانیاں، ماقبلِ تاریخ کے قصے، سوانح، سائنس کی لگ بھگ ہر شاخ پر معلوماتی کتابیں، انسائیکلوپیڈیا، ڈرامہ، نظم، مزاح (مگر طنز نہیں) غرض سب کچھ بچوں کو دیا جا سکتا ہے شرط صرف وہی ہے کہ جو مواد اُن کے ہاتھوں میں پہنچے وہ دیکھنے میں خوبصورت اور پڑھنے میں دلچسپ ہو۔

میرا خیال ہے کہ اس سطح پر اگر اچھا غیر نصابی مواد بچوں کو ملتا رہے تو وہ اُن کی آئندہ زندگی میں اُن کا اخلاقی کردار بنانے میں بھی معاون ہوگا اور اُن کی معاشی زندگی کے لیے راہیں متعین کرنے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

موجودہ صورتِ حال

اس اہم ترین موضوع کو کسی دوسرے بڑے موضوع کے بالکل آخر میں رکھ کر اس پر جزوی روشنی

ڈالنا فی الحقیقت پورے مسئلے کے ساتھ ناانصافی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن فی الوقت اسی پر اکتفا بھی ضروری ہے۔

پچھلے عرصے میں جامعہ اور مکتبہ جامعہ نے اس سلسلے میں کچھ کام ضرور کیا تھا۔ جامعہ کی پہلی نسل کے بزرگوں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، صالحہ عابد حسین، عبدالواحد سندھی، عبدالغفار مدھولی، شفیع الدین نیر، محمود الحسن وغیرہ نے بچوں کے لیے پورے ایک منصوبے کے تحت کتابیں لکھیں بھی تھیں اور مکتبہ جامعہ نے اس وقت کے معیار کے مطابق انھیں کافی اچھا شائع بھی کیا تھا آزادی کے بعد کچھ سرکاری اداروں نے بھی کچھ بہت اچھی کتابیں چھاپی ہیں جن میں سے بعض کو آئندہ کے لیے نمونہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ نجی ادارے چونکہ کاروباری بندشوں میں سرکاری اداروں سے زیادہ جکڑے ہوئے ہیں اس لیے وہ بچوں کا معیاری ادب شائع کرنے میں بے حد دقت محسوس کرتے ہیں۔ اگر ایک ہی جملے میں مجموعی حیثیت کو بیان کرنا ہو تو شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بچوں کے لیے اردو ادب میں غیر نصابی مواد کا جو ورثہ موجود تھا وہ بھی پچھلے کچھ عرصے میں ہماری زیادتیوں کی نذر ہو چکا ہے اور اب جتنا ہمیں درکار ہے اُس کے نشانات تو کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں، حقیقی مواد بہت کم ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ جن لکھنے والوں نے اردو میں بچوں کے غیر نصابی ادب کی تخلیق کو اپنا میدان بنایا تھا وہ بھی ترغیب کی کمی کی وجہ سے اس سے رفتہ رفتہ بددل ہوتے چلے گئے۔ ناشرین کی پریشانیاں ایک الگ باب ہیں۔ اور والدین کی بے اعتنائی اور کسی حد تک قوتِ خرید کی کمی، یہ سب چیزیں مل کر بچوں کو ایک اہم ترین نعمت سے محروم کر رہی ہیں۔ چونکہ ملک کی دوسری زبانیں اس میدان میں اب اتنی پیچھے نہیں ہیں اور بعض بعض میں بہت قابلِ قدر کام ہو رہا ہے اس لیے اردو پڑھنے والے بچے بالخصوص اِس محرومی کا شکار نظر آتے ہیں۔

میری ناچیز رائے میں سب سے پہلی ضرورت اس مسئلے کی حقیقی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کی ہے۔ اگر ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ موجودہ دور میں بچوں کی علمی اٹھان میں نصابی مواد کی جتنی اہمیت ہے ایک مکمل اور ہمہ جہتی نشوونما کے لیے غیر نصابی مواد بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے تو ہم مسائل کے حل تلاش کر لینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ہم صرف اسکول کے بچوں (روایتی تعلیم) کے محدود دائرے سے باہر نکل کر اُن بچوں کے مسائل کو بھی ذہن میں رکھیں جو کچھ مجبوریوں کی بنا پر ابتدائی جماعتوں سے

ہی تعلیم چھوڑ دیتے ہیں (جن کے لیے Drop-outs کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور جن کی تعداد بالخصوص ہمارے معاشرے میں بہت زیادہ ہے) تو ہمیں غیر نصابی مواد کی اہمیت نصابی مواد سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے چونکہ اس کے ذریعے غیر روایتی Nonformal تعلیم کا کام زیادہ آسانی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

شاید اس بات کو دُہرانے کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اتنا عظیم کام انفرادی، غیر منظم اور وقتی کوششوں سے پورا نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ اتنا بڑا ہے اور اس کے اتنے پہلو ہیں کہ جب تک اس کے حل کے لیے ایک منظم اور منصوبہ بند کوشش نہیں کی جائے گی کامیابی مشکل ہے۔ پچھلے بیس پچیس سال میں اس میدان میں جو خلا پیدا ہو چکا ہے اُسے پُر کرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہنے کا کام ایک مکمل منصوبے کے تحت ہی کیا جا سکتا ہے۔

میں آپ کے سامنے چند تجاویز پیش کر رہا ہوں۔ ممکن ہے ان پر آئندہ کسی مناسب موقع پر پوری طرح غور و فکر کے بعد کامیابی کی کچھ راہیں پیدا کی جا سکیں۔

۱۔ وہ مصنفین جو بچّوں کے لیے اردو میں کچھ کام کرنا چاہتے ہیں وہ پوری سنجیدگی اور صدقِ دلی سے اس میدان میں کام کریں۔ مختلف عمر کے بچّوں کی ضروریات کا سائنٹفک انداز میں مطالعہ کریں اور اپنی ہر تحریر، پڑھنے والوں کی عمر کا تعین کرنے کے بعد تیار کریں۔ ممکن ہے انھیں اپنی محنت و مشقت کے تناسب سے معاوضہ اور قدر و منزلت نہ مل سکے لیکن انھیں دماغی سکون اور دلی خوشی سے شاید کوئی محروم نہیں کر سکتا۔

۲۔ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے جو اردو کی بقا، فروغ اور توسیع کے لیے کوشاں ہیں وہ اس نکتے کو پوری طرح محسوس کریں کہ بچّوں کے لیے ادب شائع کرنا اور بالخصوص معاونِ نصاب یا غیر نصابی مواد کو بہتر سے بہتر طور پر بچّوں کے ہاتھوں میں پہنچانا اس زبان کی بقا کے لیے اوّلین اور بنیادی کام ہے۔ خیال رہے کہ موجودہ نسل کے فرائض میں سے ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی نسل تیار کر سکے جسے اردو ادب کا عظیم اور بے مثال ورثہ سونپا جا سکے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کام ابھی صحیح معنوں میں شروع ہی نہیں ہوا ہے۔

۳۔ بزرگ اور والدین اپنی معاشی پریشانیوں کے باوجود بچّوں کے لیے معاونِ نصاب کتابیں

اور دیگر مواد خریدنے کی طرف توجہ دیں تاکہ ایک طرف اُن کے بچّوں کی ذہنی نشو ونما میں مدد ملے اور دوسری طرف بچّوں کے لیے اردو ادب کی تیاری اور اس کی اشاعت میں اضافہ ہو۔

۴۔ ہر اسکول میں بچوں کی ایک لائبریری ہو جو برائے نام نہ ہو بلکہ ہر روز کھلے اور کتابوں کے سرورق میلے ہونے اور جلدوں کے گندہ ہونے کے حقیقی خدشات کے باوجود بچوں کو کتابیں گھر لے جانے کی ترغیب دے۔ اسکول کے اساتذہ اس پر پوری توجہ دیں اور بچوں میں کتاب پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔ وقتاً فوقتاً بچوں سے اُن کی پڑھی ہوئی کتابوں پر گفتگو کریں اور مختلف موضوعات کی دلچسپ کتابوں کی طرف بچوں کی توجہ مبذول کراتے رہیں۔ اس کام کے لیے دہلی ایڈمنسٹریشن سے مناسب مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ والدین اور دیگر ذرائع سے بھی مدد حاصل کی جائے۔

۵۔ حکومت تمام ان اداروں کو مالی اور ہر طرح کی مادّی مدد فراہم کرے جو بچّوں کے ادب کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اردو کی طباعت میں زیادہ لاگت، اور تعدادِ اشاعت کے محدود ہونے کی وجہ سے بچوں کی کتابوں کی قیمت اُن کی قوتِ خرید سے بہت زیادہ ہوتی ہے حکومت کو اس طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ براہِ راست یا بالواسطہ طباعت میں مالی مدد دے کر حکومت اِن کتابوں کی قیمت کم کرنے میں کافی مدد کر سکتی ہے۔

۶۔ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ .N. C. E. R. T کے تحت بچوں کی کتابوں کی اشاعت کی ایک نئی اسکیم شروع کی جا رہی ہے جس میں خاص طور پر سائنس کی مختلف شاخوں پر اچھی کتابیں شائع کروائی جائیں گی اور ہر کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ ہوگی۔ اِن کتابوں کو ملک کے ممتاز عالم تیار کریں گے۔ اِس ادارے سے پُرزور اپیل کی جائے کہ وہ دوسری زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی اِن کتابوں کو شائع کرائے۔

بہر حال آخر میں میں اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کسی زبان کی ترقی، فروغ، اور اُس کی بقا میں حکومت یقیناً بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور ہمیں اُس کا پورا پورا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش بھی کرنی چاہیے مگر اس کا بنیادی حل تلاش کرنا خود ہمارا اپنا فرض ہے۔ جب تک ہم اِس کی بقا کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھائیں گے کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے سے مدد کی توقع بھی

نہیں کی جا سکتی۔ بچوں کے لیے غیر نصابی مواد کے مسئلے کے حل کے لیے ہمیں خود ہی کوئی منظم منصوبہ بنا کر اُس پر کام کرنا ضروری ہے۔ یقیناً ابھی ذرائع بہت کم بلکہ بالکل مفقود ہیں، دشواریاں بلکہ بعض صورتوں میں ایسی مصنوعی رکاوٹیں بھی ہیں جن کا سامنے سے ہٹانا شروع میں بالکل ناممکن سا لگتا ہے۔ مگر یہ بات بھی یقینی ہے کہ یہ کیفیات یوں ہی رہیں گی، بلکہ اگر عمل نہ کیا گیا تو وقت کے ساتھ ساتھ دشواریاں اور بڑھیں گی۔ لہٰذا مواقع اور ذرائع کی کمی کے باوجود اسی میں کام شروع کرنا ہے۔ میں 'ہمت مرداں' والے مصرعے کی بجائے پڑھتا ہوں۔ ؎

ہمّت ہو تو اڑ چل صفتِ قطرۂ شبنم
بے بال و پری مانعِ پرواز نہیں ہے

صفدر نقوی

سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری اسکول کی سطح پر معاون نصاب مواد اور اس کی ضرورتیں

"علم ایک ایسا سمندر ہے جس کی تھاہ نہیں" یہ بات سیکڑوں برس پہلے سے کہی جاتی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ اس سمندر میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ اور اب تو علم و واقفیت کا ایک سیل رواں، رفتار، حدود اور گہرائی میں انسانی تصور کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ انسان کی زندگی بہت مختصر ہے اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی آدمی سب کچھ سیکھ سکے یا جان سکے۔ اس لیے علم کو شعبوں میں تقسیم کیا گیا اور یہ کافی سمجھ لیا گیا کہ علم و عمل کے کسی محدود دائرے میں خصوصی مہارت حاصل کی جائے۔ یہ محدود دائرۂ عمل مہارت کی باریکیوں کے ساتھ مزید حصوں میں تقسیم ہوتا جاتا ہے۔ ایک فرد سائنس کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ سائنس کے بہت سے شعبوں میں سے ایک مثلاً طبی سائنس کو اپنے لیے منتخب کرتا ہے۔ طبی سائنس میں سرجری کو اختیار کرتا ہے۔ اور پھر ایک عضو، آنکھ یا دل کی سرجری میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ اس مہارت یا اسپیشلائزیشن Specilization کا درجہ جتنا اونچا ہوتا جاتا ہے اس کا حلقۂ عمل اتنا ہی مختصر ہوتا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہ اعلیٰ مہارت خصوصی فرد کو اپنے گرد و پیش سے اور عام معلومات سے بے نیاز و بیگانہ کر دیتی ہے۔ فرد کی زندگی میں یہ عدم توازن تعلیم کی زبردست خامی کی طرف اشارہ کرتا ہے، اگر نصاب تعلیم کو تیار کرتے وقت تعلیم کو اس خامی سے پاک رکھنے کی شعوری کوشش نہیں کی جاتی تو یہ عدم توازن صرف فرد کی زندگی کو ہی متاثر نہیں کرے گا بلکہ اس سے سماجی رشتوں کے کمزور پڑنے یا آگے چل کر شیرازے کے منتشر ہونے کا اندیشہ ہے۔

مقاصد کا تعیّن

آج کے جمہوری دور میں جب علم حدود تصور سے آگے نکل چکا ہے اور دوسری طرف تعلیم خواص سے نکل کر عام لوگوں تک پہنچ رہی ہے، یہ طے کرنا پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ تعلیم کیوں دی جائے۔ تعلیم کے مقاصد، عمر، سمجھ اور ضرورت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں اور ان مقاصد کی بنیاد پر لامحدود علم میں سے تدریس کے لیے درجہ بدرجہ انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہی انتخاب نصاب تعلیم ہے۔

آج چودہ پندرہ سال کا بچہ نویں جماعت میں پہنچ جاتا ہے اور چار سال کی تعلیم کے بعد اٹھارہ انیس سال کی عمر میں بارھویں جماعت سے فارغ ہوتا ہے۔ اور یہی چودہ پندرہ سال سے لے کر اٹھارہ انیس سال تک کی عمر کا زمانہ بچّوں میں زبردست ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کا زمانہ ہوتا ہے یعنی "عنفوان شباب"۔ جسمانی تبدیلیاں بچّوں میں ایک بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ہمت اور کارکردگی کا ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بچّے کچھ کر گذرنا چاہتا ہے، اس وقت بیکاری، مشاغل کی کمی، مہم جوئی کے ناکافی مواقع، بچّوں میں تلوّن، عدم اعتمادی اور بے راہ روی پیدا کر سکتے ہیں۔ زیرِ نظر جماعتوں کا نصاب تعلیم اس عمر کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ہی ترتیب دیا جانا چاہیے۔

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر عرض کردوں کہ نصاب کے تعیّن کے سلسلے میں ایک عملی دقّت یہ ہے کہ نصاب کی تیاری کا کام عام طور پر مضامین کے ماہرین کے سپرد ہوتا ہے جو بچّوں کی ضرورتوں کو پسِ پشت ڈال کر مضامین کا زیادہ سے زیادہ حصّہ اور اس کی جزئیات کو نصاب میں شامل کردیتے ہیں۔ یہ کوئی ایک مضمون کے ماہر نہیں کرتے۔ تمام مضامین کے ماہر اپنے مضمون کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے اس معصوم غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں اور علم کے سیلِ رواں یعنی نالج برسٹ Knowledge Brust کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصاب کا مرکز بچّے اور ان کی ضرورتوں کے بدلے مضامین اور علم کا سیلِ رواں بن جاتے ہیں۔

غیر ملکی حکومت کے زمانے میں تعلیم کا مقصد حکومتی مشین کے پرزے یعنی چھوٹے بڑے

کلرک تیار کرنا تھا آزادی ملنے کے بعد خاص طور سے تعلیمی اصلاح و ترقی کے لیے مختلف کمیٹیاں اور کمیشن بنائے گئے۔ ہر کمیٹی یا کمیشن کی رپورٹ میں تعلیم کے مقاصد پر تفصیلی بحث کی گئی ہے کسی کمیشن نے تعلیم کو اچھے رہنما پیدا کرنے کا ذریعہ بتایا تو کسی نے اسے بین الاقوامی مفاہمت پیدا کرنے کا وسیلہ قرار دیا کسی نے تعلیم کو انفرادی اور ملکی سطح پر معیارِ زندگی اور قومی معیشت میں ترقی کے لیے استعمال کرنے پر زور دیا تو کسی نے اسے سماج میں بہتر تبدیلیاں یا سوشل چینج Social Change کا بہترین آلۂ کار ٹھہرایا۔ الفاظ کی تبدیلی، جملوں کی قطع و برید اور ان کی بناوٹ میں رد و بدل کے باوجود تعلیم کے عام مقاصد دو ہی ہیں یعنی شخصیت کی نشو و نما اور اسے سماج کا کارآمد رکن بنانا۔ فرد کی شخصیت میں اس کی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی نشو و نما شامل ہے تو دوسری طرف سماج، خاندان کے چند نفوس سے لے کر، قومیت، بین الاقوامیت اور انسانیت تک کا احاطہ کرتا ہے۔ تعلیم کے یہ عام مقاصد ہر عمر اور سطح پر پیشِ نظر رکھنے ضروری ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ ابتدائی درجات میں فرد کی نشو و نما پر زیادہ زور ہونا چاہیے تو ثانوی تعلیم کے زمانے میں دونوں پہلوؤں پر تقریباً برابر۔ بہترین تعلیم وہ ہے جو وقت اور ضرورت کے ساتھ فرد میں بہتر تبدیلیاں تو پیدا کرے ہی لیکن وہ دوسروں کی کیفیت، ان کے جذبات اور ان کی مجبوریوں کو بھی سمجھ سکے اور ان کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کر سکے۔ باعزت اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ مجھے یہاں اکبر الہ آبادی کا ایک شعر بے ساختہ یاد آگیا۔ نفسِ مضمون سے ہٹ کر کچھ ضرور ہے لیکن تعلیم کے منفی پہلو پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔ ؎

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بچّے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ثانوی درجات کا نصاب

ہندوستان کے زیادہ تر حصّوں میں نویں اور دسویں جماعتیں سیکنڈری یا ہائی اسکول سطح اور گیارھویں اور بارھویں جماعتیں سینیر سیکنڈری، جونیر کالج یا انٹرمیڈیٹ کی سطح کہلاتی ہیں۔ تعلیمی کمیشن ۶۶-۱۹۶۴ کی سفارش پر، این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے بنائے نصاب اور مروجہ تقسیم

کے مطابق سیکنڈری اسکول کی سطح تک ہمہ گیر تعلیم General Education کا انتظام ہے اور سینیر سیکنڈری کی سطح پر نوعیت کے اعتبار سے مختلف مضامین کی تعلیم کا۔ وزارت تعلیم حکومت ہند کی طرف سے گذشتہ اگست میں جو کتابچہ "چیلنج آف ایجوکیشن" کے نام سے شائع ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی میں بھی سیکنڈری سطحیں انہی جماعتوں پر مشتمل اور مضامین کی اسی تقسیم کے ساتھ جاری رہیں گی۔

ایجوکیشن کمیشن (۱۹۶۴-۶۶) نے سیکنڈری اسکول کی سطح تک ہمہ گیر تعلیم کے مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور دسویں کلاس تک ہمہ گیر تعلیم کو ضروری سمجھا ہے "تاکہ عام معلومات کی ایک ٹھوس بنیاد قائم ہو جائے اور آگے چل کر سائنس یا کامرس کے کسی شعبے میں خصوصی مہارت عام معلومات سے بے بہرہ نہ بنادے یا آرٹس یا کامرس کی تعلیم پانے والے سائنس کی اس دنیا میں سائنس سے بالکل ہی نابلد نہ ہوں۔

سہ لسانی فارمولے کے مطابق تیسری زبان آٹھویں جماعت تک ختم ہو جاتی ہے۔ نویں اور دسویں جماعتوں میں دو زبانیں، جن میں سے عام طور پر ایک انگلش ہوتی ہے، حساب، سائنس اور سماجی علوم پانچ مضامین ہیں۔ ان مضامین کا امتحان دسویں جماعت کے اختتام پر سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن یا کوئی ریاستی امتحانی بورڈ لیتا ہے۔ دو مضامین فزیکل ایجوکیشن اور ایس۔یو۔پی۔ڈبلیو S. U. P. W. یعنی سماجی طور پر کارآمد اور پیداواری کام کا امتحان اسکول میں ہوتا ہے اور نتیجہ بورڈ کو بھیج دیا جاتا ہے۔ سائنس تین مضامین فزکس، کیمسٹری اور بایولوجی کا مجموعہ ہے تو سماجی علوم میں بھی تین مضامین تاریخ، علم شہریت اور جغرافیہ شامل ہیں۔ سائنس اور حساب کے دو کورس ہیں ایک آسان اور دوسرا مشکل۔

سینیر اسکول کی سطح پر یعنی گیارھویں اور بارھویں جماعتوں میں تعلیم کو چار شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آرٹس، سائنس، کامرس اور پیشہ ورانہ یعنی کسی حرفے کی تعلیم۔ ہر طالب علم ان میں سے کسی ایک شاخ کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ یہ خصوصی مہارت یا اسپشلائزیشن Specilization کی ابتدا ہے۔

سینیر سیکنڈری سطح پر بھی مندرجہ بالا چار شاخوں میں سے کسی ایک کے پانچ مضامین لینے

ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک زبان اور چار مضامین، یادو زبانیں اور تین مضامین لیے جاسکتے ہیں۔ آرٹ گروپ میں تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، معاشیات، نفسیات، سماجیات وغیرہ مضامین ہیں اور سائنس گروپ میں حساب اور فزکس اور کیمسٹری کے ساتھ بایولوجی لے کر طبی سائنس کی تیاری اور جیومیٹریکل ڈرائنگ لے کر انجینئرنگ کی تیاری کی جاتی ہے۔ کامرس گروپ میں حساب اور معاشیات کے ساتھ کامرس کے ایک یا دو مضامین لیے جاتے ہیں۔

علم کی طرح ہر مضمون آج لامحدود ہے۔ ان مضامین کے جتنے حصے کو عمر کے ایک مخصوص حصے میں ایک مقررہ مدت کے اندر سیکھ لینا ضروری سمجھا جاتا ہے اسے نصاب کہتے ہیں۔ نصاب کا تعین کرنے میں عمر، ذہنی معیار اور مدت کے علاوہ اس خاص سطح پر تعلیم کے مقاصد کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ ایک ہی عمر کے سب بچے ذہانت کے اعتبار سے برابر نہیں ہوتے۔ ان کی ذہنی عمر اصلی عمر سے مختلف ہوتی ہے۔ لیکن ابھی ذہنی عمر نکالنے اور اس کے مطابق جماعت بندی کرنا کم از کم ہمارے یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جماعت بندی اصلی عمر ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ذہانت کے معیار مقرر کر کے ایک ہی عمر کے بچوں کے لیے مختلف نصاب وضع کیے جائیں۔ اس لیے نصاب کا تعین کرتے وقت ذہانت کی عام سطح کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ ایسا نصاب ذہنی طور پر کمزور بچوں کے لیے کچھ مشکل ہوتا ہے تو دوسری طرف اعلیٰ ذہانت کے بچوں کے لیے اس سے اونچے معیار، موضوع کی جزئیات اور تفصیلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں بہتر طریقۂ تعلیم کے ساتھ بچوں کو ایسا مواد فراہم کرنا ضروری ہے جو نصاب کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکے۔ اس معاون نصاب مواد میں نصاب سے متعلق موضوعات اور ان کی تفصیلات اور جزئیات بھی ہوں اور ساتھ ہی اس قسم کے دوسرے موضوعات کا تعارف بھی۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ اس معاون مواد کو نصاب کی کتابوں کی طرح رسمی نہ بنایا جائے بلکہ دلچسپ اور دلکش ذرائع سے بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے۔

معاونِ نصاب مواد

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ یہ سائنس کا زمانہ ہے اور سائنس نے سماجی اور نظری دونوں

طریقوں سے تعلیمی میدان میں بہت سہولت پیدا کردی ہے۔ ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن عوامی رابطے کے بہترین ذرائع تو ہیں ہی لیکن ان کے ذریعے سیکھنے کا عمل جتنا تیز ہوسکتا ہے ان کے بغیر اتنی تیزی ممکن نہ تھی۔ پہلے صرف کتابیں ہی معلومات اور رسمی تعلیم کے بعد اضافی معلومات کا ذریعہ تھیں جن لوگوں کو سیکھنے کا شوق ہوتا تھا وہ اپنی دلچسپی کی کتابوں سے علم حاصل کرتے تھے۔ چھاپے خانے کی ایجاد سے صدیوں پہلے بھی دنیا میں کچھ ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کا تعلق علم کی کسی ایک شاخ سے نہ تھا ان میں رائج الوقت تمام علوم سموئے ہوئے تھے۔ یوں تو ادب عام طور پر اپنے زمانے کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، ساتھ ہی قاری کے خیال و عمل کو متاثر بھی کرتا ہے۔ لیکن کچھ کتابیں اپنی دلچسپی، ہمہ گیری اور تاثر کے لحاظ سے آفاقی اور دوامی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں یہاں خاص طور پر الف لیلیٰ اور پنچ تنتر کی کہانیوں کا ذکر کروں گا۔ الف لیلیٰ انسانی تعلقات میں تنوع اور توازن کی نقیب ہے تو پنچ تنتر حیوانی کرداروں کے ذریعے انسانوں کو زندگی کا سبق سکھاتی ہے اور ان کی مشترک خوبی ہے وہ دلچسپی جو قاری کو پوری کتاب پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں بچّوں کے لیے خصوصی ادب کی ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا جانے لگا۔ یورپی زبانوں میں اس سے پہلے ہی کام شروع ہوچکا تھا۔ اب سے ستّر اسّی برس پہلے ہندوستانی زبانوں میں بچوں کے ادب کی تخلیق شروع ہوئی۔ اردو میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لوگوں نے خصوصاً اس ادب کو پروان چڑھایا۔ آزادی ملنے کے بعد بچّوں کے ادب کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں بچّوں کے ادیبوں کی ہمت افزائی کے لیے حکومت ہند اور این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کی طرف سے بچّوں کے ادب کے کل ہند مقابلے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ فی زمانہ بچّوں کا ادب موضوع اور شمل کے لحاظ سے تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔

بچّوں کے ادب میں یہ کام صرف چودہ سال تک کے بچّوں کے لیے ہوتا ہے۔ سیکنڈری اور سینیر سیکنڈری سطح کے طلبا کے لیے باقاعدگی کے ساتھ ایسا کام بہت کم ہوا ہے۔ ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے جو اس عمر کے طلبا کے لیے مقصدیت کے ساتھ لکھی جائیں۔ ویسے اس عمر کے لڑکے اور لڑکیاں عام ادبی کتابوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

ریڈیو: تعلیم میں معاون کے طور پر ریڈیو کا استعمال کافی پرانا ہے۔ سب سے پہلے، ۱۹۲۷ء میں مدراس اسٹیشن سے اسکول براڈ کاسٹ شروع ہوا۔ کلکتہ اسٹیشن نے اسے ۱۹۳۲ء میں شروع کیا۔ آزادی کے بعد ریڈیو اسٹیشن بھی زیادہ بنے اور ریڈیو کا استعمال بھی زیادہ شروع ہوا۔ آج ۸۴ ریڈیو اسٹیشنز میں سے ۶۸ تعلیمی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ پرائمری تعلیم کے لیے زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔ ثانوی تعلیم کے لیے سال میں ۲۰۰ دن پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ تامل ناڈو ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں ریڈیو کو پوری سنجیدگی کے ساتھ تعلیمی ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ریاستی حکومت نے ۳۶۰۰۰ (چھتیس ہزار) اسکولوں کو مفت ریڈیو سٹ دیے ہیں تاکہ اسکولی نشریے سُنے جاسکیں۔

ریڈیو کے تعلیمی نشریات میں مختلف مضامین کے اسباق بھی شامل ہیں اور تعلیم سے متعلق عام موضوعات پر براڈ کاسٹ بھی۔ لیکن عام طور پر ان نشریات سے فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام اسکولوں کا سروے کیا جائے تو تامل ناڈو کو چھوڑ کر شاید ایک ہزار میں سے ایک اسکول ایسا نکل سکے جو ان نشریات سے فائدہ اٹھاتا ہو۔

سائنسی بحثیں، سیاسی گفتگو، تاریخی ڈرامے وغیرہ جو عام نشریات کا حصہ ہیں، ثانوی درجات کے طلبا کے لیے دلچسپی کا باعث ہوسکتے ہیں۔

فلم: شہری علاقوں میں آج کی مقبول ترین دلچسپی فلم ہے۔ خاص طور پر عنفوان شباب میں لڑکیوں اور لڑکوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب فلم میں مل جاتی ہیں۔ جاسوسی، مار دھاڑ، جرأت اور بہادری کے کارنامے، موسیقی اور رومان سب کچھ آج کی فلم میں مل جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کے لڑکے اور لڑکیاں فلموں کے ہیرو، ہیروئن اور گانوں وغیرہ کے سلسلے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں۔ بعض اچھی فلمیں یقیناً سماجی مسائل کی طرف توجہ مبذول کراتی ہیں۔ کچھ نام نہاد تاریخی فلمیں بھی بنی ہیں لیکن کہانی کی دلچسپی اور ضرورت کی خاطر تاریخی واقعات توڑ موڑ کر اور کبھی کبھی بالکل غلط پیش کیے جاتے ہیں اور کردار مسخ ہوجاتے ہیں۔

حکومت کی طرف سے ایک پابندی قابل تحسین ہے کہ ہر فلم سے پہلے حکومت کی فلم ڈویژن کی کوئی دستاویزی فلم ضرور دکھائی جاتی ہے جو عام طور پر قومی ترقی کے کسی پروگرام سے

متعلق ہوتی ہے۔ لوگ اس میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے لیکن جب پردے پر متحرک چیزیں دیکھتے ہیں تو کچھ نہ کچھ تو سیکھتے ہی ہیں۔

ٹیلی ویژن بھی تعلیمی امداد کا زبردست ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں ٹیلی ویژن اب سے کوئی پچیس سال پہلے شروع ہوا تھا اس کی ابتدا ہی سے اسکول پروگرام شروع ہو گئے تھے۔ ساتویں دہائی کے ابتدائی حصے میں دہلی کے ہائر سیکنڈری اسکولوں کو حکومت کی طرف سے ٹیلی ویژن سٹ دیے گئے تھے۔ ٹی وی پر بھی اسکول پروگرام ۲۰۰ دن ہی ہوتے ہیں۔ تدریس میں مدد کرنے کے لیے ٹی وی پر مختلف مضامین کے سبق باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے پروگرام بھی شروع ہوئے ہیں جو مختلف سماجی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ٹیلی ویژن فلم کی طرح سماعی اور نظری دونوں حواس کا مرکز بن کر جیتی جاگتی، بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویروں اور مناظر کے ذریعے "سیکھنے" کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہم اس ذریعے سے نصاب کو دلچسپ اور آسان بنانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے غیر رسمی تعلیمی پروگرام دیکھنے والوں کی دلچسپی کو قائم رکھ سکتے ہیں اور سیکھنے کے عمل کو فطری اور آسان بنا دیتے ہیں۔

ڈرامے، ڈبیٹ اور جلسے وغیرہ: یہ تعلیمی مشاغل بچوں میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بڑھاتے ہیں۔ اپنے مافی الضمیر کو بہتر اور موثر طریقے سے ادا کرنا ایک بہت بڑا فن ہے۔ یہ فن زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ یوں تو ہر عمر میں یہ مشاغل انسان کے لیے مفید ہیں لیکن عنفوان شباب کا زمانہ اس تربیت کے لیے سنہری زمانہ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب خود نمائی کی جبلّت اس قسم کے مشاغل کے لیے محرک کا کام کرتی ہے۔

کھیل کود: بظاہر کھیل کود کا نصاب تعلیم سے تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن کھیل کود ایک طرف تو جسمانی صحت کو بہتر بناتے ہیں دوسری طرف بچپن اور عنفوان شباب میں زائد انرجی کو صرف کرکے ایک متوازن شخصیت کی تشکیل میں مدد کرتے ہیں۔

معاون نصاب مواد کی ضرورتیں

۱۔ لائبریری: ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن یقیناً تعلیم میں بہترین معاون ہیں۔ لیکن نہ یہ ہر وقت

مہیا ہیں اور نہ ان میں فرد کے انتخاب کو زیادہ دخل ہے۔ ہم وہی کچھ دیکھ سکتے ہیں جو فلم میں ہے، ٹی وی پر دکھایا جارہا ہے۔ ہم وہی کچھ سن سکتے ہیں جو ریڈیو پر پیش کیا جارہا ہے۔ اور ان ذرائع کو عام دلچسپی کا خیال رکھنا ہے۔ وہی پروگرام زیادہ تر پیش کیے جائیں گے جنھیں عام طور پر لوگ دلچسپی سے دیکھیں۔ صرف ایک ذریعہ ایسا ہے جو طالب علم اپنی دلچسپی کے لحاظ سے، اور جس وقت چاہے اختیار کرسکتا ہے۔ اور وہ ہے کتاب۔ ٹی وی اور ریڈیو کی ترقی کتنی ہی کیوں نہ ہو جائے اُن پر بامقصد تعلیمی پروگرام کسی حد تک بھی دکھائے جانے لگیں کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوسکتی۔ ہر شخص جس وقت چاہے اپنی دلچسپی اور ضرورت کے لحاظ سے کتابوں کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی اسی وقت ممکن ہے جب مطلوبہ کتابیں آسانی کے ساتھ فراہم ہوسکیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص ساری کتابیں رکھ سکے۔ خاص طور پر طالب علمی کے دور میں۔ اس لیے اسکول میں ایک اچھی لائبریری تعلیم میں بہت مدد کرسکتی ہے اور ایک اچھی لائبریری کے لیے مندرجۂ ذیل باتیں ضروری ہیں۔

ا۔ اسکول کا پرنسپل اور انتظامیہ ایک اچھی لائبریری کی ضرورت کو محسوس کرے۔ اس کے لیے مناسب رقم کا انتظام ہو مناسب جگہ کا انتظام ہو۔ کتابیں اس طرح رکھی جائیں کہ خراب نہ ہوں جاری کرنے کا نظام ایسا ہو کہ کتابیں ضایع نہ ہوں۔

ب۔ لائبریری کشادہ جگہ میں ہو۔ اس کے ساتھ دارالمطالعہ بھی ہو تاکہ بچے کتابوں کا انتخاب کرسکیں اور ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکیں۔

ج۔ عمر اور علمی معیار کے مطابق کتابیں مہیا ہوں۔ سائنسی مضامین، افسانے اور ناول ہوں تاریخی ڈرامے ہوں، زبان اور ادب سے متعلق مختلف قسم کی کتابیں موجود ہوں۔ ثانوی درجات میں تعلیم میں معاون ہونے والی کتابیں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت دلچسپ انداز میں لکھنے کا کام ہونا چاہیے۔ ابھی اردو اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں اس معیار کی دلچسپ کتابوں کی بہت کمی ہے

د۔ مطالعہ خود ایک فن ہے۔ طلبا کو کتابیں پڑھنے کے فن کی تربیت دی جائے۔ اس سے انھیں مطالعے میں مزا آنے لگے گا۔ افسانے، ناول، علمی کتابیں اور اخبار پڑھنے کے الگ الگ انداز ہیں خاموش مطالعہ ضروری ہے تو زور سے پڑھنا بھی کچھ کم اہم نہیں۔ ایسی چیزیں جو سمجھنے کے ساتھ یاد رکھنی بھی ضروری ہیں باآوازِ بلند پڑھنی چاہئیں تاکہ زبان کے ساتھ کان بھی سمجھنے اور یاد رکھنے میں

مددگار ہوں۔ یکسوئی مطالعے کی ایک لازمی شرط ہے۔ ذہن کو تربیت دی جائے کہ جب پڑھیں تو ذہن پوری طرح مطالعے کی طرف متوجہ رہے۔ دارالمطالعے میں پڑھنا یا جہاں دوسرے بھی پڑھ رہے ہوں آواز کے ساتھ پڑھنا دوسروں کی توجہ ہٹائے گا۔ ایسی جگہ خاموش مطالعے کی تربیت ہو سکتی ہے۔ مناسب ہے کہ ہفتے میں لائبریری کا ایک پیریڈ رکھا جائے اور اس میں بچوں کو مطالعے کی تربیت دی جائے۔

۵۔ ایک اچھا لائبریرین استادوں کے تعاون سے بچوں کے مطالعے کے لیے اچھا رہنما ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے اچھی لائبریری کے ساتھ اچھے لائبریرین کا تقرر بھی ضروری ہے۔ ایک تربیت یافتہ لائبریرین لائبریری کو بہتر بنانے، کتابیں جاری کرنے کے طریقے اور وقت طے کرنے، لائبریری اور دارالمطالعے کے بہتر استعمال کے قاعدے بنانے میں پرنسپل کو مشورے دے سکتا ہے۔

۲۔ طریقۂ تعلیم: استاد خود مطالعے کے شوقین ہوں اور طلبا کو مطالعے کے لیے اکسا سکیں تو بچوں میں مطالعے کی عادت پڑ سکتی ہے۔ اگر استاد طلبا کے سامنے مسائل رکھ کر کتابوں کی مدد سے ان کے حل تلاش کرنے میں طلبا کی ہمت افزائی اور رہنمائی کریں تو طلبا میں مطالعے کا شوق پیدا ہوگا اور اسی ذریعے سے ذہنی تسکین حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

پروجیکٹ طریقۂ تعلیم ایک آزمودہ طریقۂ تعلیم ہے جس کے ذریعے بچوں میں تلاش و جستجو کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ پروجیکٹ میں طے شدہ پروگرام کے مطابق طلبا نصاب سے کہیں زیادہ سیکھ سکتے ہیں۔

۳۔ فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن: حکومت ہند کے فلم ڈویژن میں فلموں کی ایک لائبریری ہے۔ یہ محکمہ اسکول میں مفت فلم دکھانے کا انتظام کرتا ہے۔ وہاں ایسی بہت سی دستاویزی فلمیں ہیں جو ثانوی سطح کے طلبا کے لیے بہت مفید ہیں اور تدریسی کام میں معاون ہو سکتی ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ایسے پروگرام آتے رہتے ہیں جو ثانوی درجات کے نصاب سے متعلق ہوتے ہیں۔ سائنس اور معلومات عامہ سے متعلق کئی مستقل پروگرام وقتاً فوقتاً دکھائے اور سنائے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں کا اعلان کافی پہلے سے ہو جاتا ہے۔ اگر متعلقہ استاد ان پروگراموں سے باخبر رہیں اور طلبا کو یہ پروگرام دیکھنے پر اکسائیں اور بعد میں ان پر بات

بچیت کریں توان میں ایسے پروگرام دیکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ ایک بار خود دلچسپی اور شوق پیدا ہوجائے تو پھر اکسانے یا Motivate کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۵۔ اخبار اور رسائل: اخباروں اور رسائل میں اکثر ایسے مضامین آتے رہتے ہیں جو نویں سے بارھویں جماعتوں کے نصاب سے متعلق ہوتے ہیں۔ طلبا کو ان کا علم ہو پائے اس کے لیے استاد اور لائبریرین ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ جب اپنی ضرورت کے مطابق کسی مضمون کا علم ہوگا تو طلبا ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ابتداً عرض کیا تھا کہ علم ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی وسعتیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جاتی ہیں۔ سب کو "سب کچھ" پڑھانے یا سکھانے کی خاطر یا "سیلاب علم" یا Knowledge Brust کے پیش نظر نصاب کو بہت زیادہ وزنی بنا دینے سے طلبا الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور "سب کچھ" کے بدلے اکثریت کے لیے وہ "کچھ نہیں" بن جاتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا کی عمر اور ضرورتوں کے مطابق نصاب تیار کیا جائے۔ اور ایسا مواد زیادہ سے زیادہ فراہم کیا جائے جو نصاب کی تدریس میں مددگار ثابت ہو اور بچے خود اس سے استفادہ حاصل کر کے نصاب کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ سیکھ سکیں تاکہ تعلیم کے دونوں مقصد پورے ہوں یعنی فرد کی مکمل شخصیت کی تشکیل ہو سکے اور سماج اس کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔

قیصر شمیم

این سی ای آر ٹی میں تیار ہونے والی ابتدائی جماعتوں کی نصابی کتابیں

"درس" ایک عربی لفظ ہے، جسے "سبق" یا انگریزی کی اصطلاح Lession کے معنوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ناسخ کے مندرجہ ذیل شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس لفظ کا یہ مفہوم نیا نہیں ہے ؎

عبور، اللہ نے اس کو دیا ہے علمِ باطن پر
لیا ہر چند ظاہر میں نہ درس اک حرفِ ابجد کا

اس کے علاوہ اس لفظ کا استعمال، وعظ، پند اور کتھا کے معنی میں بھی جائز رکھا گیا ہے۔ اسی طرح "درس و تدریس" کو، پڑھنے پڑھانے کے مفہوم میں عرصۂ دراز سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ایسے میں اگر آسانی کے لیے، انگریزی کی اصطلاح Curriculum کا ترجمہ "درسیات" کر لیا جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔

انگریزی میں Curriculum شعبۂ تعلیم کی نسبتاً ایک جدید اصطلاح ہے اور درس و تدریس کے اس نئے تصور کی نمائندگی کرتی ہے کہ صرف تدریسی مواد Instructional Materials ہی کی نہیں بلکہ وقت، جگہ، تدریس کے وسائل، طریقۂ تدریس اور اس کے نتائج ــــ ان سب کی سائنٹفک بنیادوں پر منصوبہ بندی کی جانی چاہیے۔ اسی لیے Curriculum سے مراد صرف نصاب Syllabus کا تعین نہیں ہے۔ نصاب، درسیات کے وسیع دائرے میں، محض تدریسی مواد کی فہرست کا نام ہے۔

این، سی، ای، آر، ٹی کا نصاب، دس سالہ اسکول کے لیے درسیات کے اسی دائرۂ کار پر مبنی ہے جس کے مسودے کو مارچ۔ اپریل ۱۹۷۵ میں تمام صوبائی حکومتوں، اور متعدد اساتذہ، تعلیمی

منتظمین اور دیگر ماہرین تعلیم کو ان کی رائے جاننے کے لیے بھیجا گیا تھا اور جسے بالآخر اگست ۱۹۷۵ء میں، درسیات پر ایک قومی کانفرنس میں، پورے ملک سے آئے تقریباً دو سو ماہرین تعلیم کے سامنے بحث و مباحثہ کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ یعنی اس کی حیثیت ایک قومی دستاویز کی ہے۔ اس دستاویز کو Curriculum for the Year - A frame work کے نام سے پہلی بار نومبر ۱۹۷۵ء میں اور پھر نومبر ۱۹۷۶ء میں این سی ای آر ٹی کے ذریعہ شائع کیا گیا تھا۔ کونسل سے ہی اس کا اردو ترجمہ بھی نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس دستاویز میں ابتدائی تعلیم کے مقاصد اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ پہلا مقصد خواندگی ہے۔ بچے کو پہلی زبان، جو کہ عام طور پر اس کی مادری زبان ہونی چاہیے، اس سطح تک سکھائی جائے کہ وہ مناسب طور پر ادا کیے جانے والے الفاظ کے ذریعے دوسروں سے گفتگو اور تحریر کی مدد سے تبادلہ خیال کر سکے۔

۲۔ دوسرا مقصد گنتی سیکھ لینا ہے۔ بچے کو حساب کے چار بنیادی قاعدوں کے استعمال میں واقفیت حاصل ہو اور انھیں اپنی سماجی زندگی میں عملی مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کرنے کا اہل ہو سکے۔

۳۔ تیسرا مقصد تکنیک کا علم ہے۔ بچے کو سائنسی تفتیش کے طریقے کو سیکھنا چاہیے اور اسے اپنی زندگی میں اور آس پاس کی دنیا میں سائنس اور تکنالوجی کی قدر کرنا شروع کرنا چاہیے۔

۴۔ بچے کے دل میں قومی پرچم اور قومی ترانے جیسی قومی علامتوں اور ملک کے جمہوری طریق عمل اور اداروں کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ اسے ہندوستان کی مرکب اور رنگا رنگ تہذیب سے واقف ہونا چاہیے اور چھوت چھات، ذات پات اور فرقہ واریت سے نفرت سیکھنا چاہیے۔

۵۔ انسانی محنت اور اس کی عظمت کی جانب بچے کو صحت مند میلانات اختیار کرنا چاہیے۔

۶۔ بچے کو صفائی اور صحت مند طریقے سے رہنے کی عادت سیکھنا چاہیے اور صاف ماحول اور حفظانِ صحت کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔

۷۔ بچے میں اچھی اور خوبصورت چیزوں کے بارے میں ذوق پیدا ہونا چاہیے اور اسے اپنے

آس پاس کی چیزوں کا دھیان رکھنا چاہیے۔

۸۔ بچے کو دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا سیکھنا چاہیے اور سب کی بھلائی کے لیے مل کر کام کرنے کی افادیت کی قدر کرنا جاننا چاہیے۔ کردار اور شخصیت کی دیگر پسندیدہ صفات جیسے اتحاد، قیادت، بھلائی، ایمان داری وغیرہ کو بھی ترقی کرنی چاہیے ساتھ ہی ساتھ اسے ایک فرد کی حیثیت سے گھر، اسکول اور اڑوس پڑوس میں اپنے رول سے بھی واقف ہونا چاہیے۔

۹۔ بچے کو اس کا اہل ہونا چاہیے کہ وہ تخلیقی سرگرمیوں میں اپنا آزادانہ اظہار کر سکے اور خود سیکھنے کی عادت اختیار کر سکے۔

فطری طور پر، این سی ای آر ٹی کی تیار کردہ نصابی کتابوں اور زائد از نصابی کتابوں Supllementary Readers میں ان رہنما اصولوں کی جھلک ملتی ہے جنھیں اس دستاویز میں بیان کیا گیا ہے۔

جیسا کہ درج کیا جا چکا ہے ابتدائی تعلیم کا پہلا مقصد خواندگی ہے، اس سطح تک کہ مناسب حد تک گفتگو اور تحریر کے ذریعے تبادلۂ خیال کرنا آ جائے۔ ظاہر ہے کہ تبادلۂ خیال کرنے کی صلاحیت کئی اور صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ کسی بات کو غور سے سننے یا پڑھنے کی صلاحیت سمجھنے کی صلاحیت اور پھر اپنی بات کے مناسب اظہار کی صلاحیت۔ اس لحاظ سے مادری زبان کی تدریس محض ایک مضمون کے طور پر نہیں بلکہ طلبہ کی کلی تربیت کے ایک لازمی جزو کے طور پر کی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں زبان کی تدریس کی نوعیت کی مزید وضاحت، مذکورہ دستاویز کے پیراگراف ۴۹، ۴ میں اس طرح کی گئی ہے:

"ابتدائی مرحلے کے خاتمے تک طالب علم کو اتنی اہلیت حاصل کر لینا چاہیے کہ وہ اس مرحلے پر عام حالات میں متوقع جملوں کی ساخت اور ذخیرۂ الفاظ کے اندر، اپنی مادری زبان کی معیاری شکل کے وسیلے سے زبانی اور تحریری اظہار کر سکے طالب علم باآواز بلند، صحیح تلفظ، موزوں لہجے، ٹھیک انداز نشست، مناسب رفتار اور پوری سمجھ کے ساتھ پڑھ سکے۔ طالب علم کو خاموش خوانی کی صحیح عادت بھی پیدا کرنا چاہیے اس مرحلے پر آسان بیانات کو سمجھ کر سننے کا اہل ہونا چاہیے۔ درمیانی اور ثانوی مرحلوں پر زیادہ اعلیٰ لسانیاتی اور فکری مواد کے ذریعے مندرجہ بالا

مہارتوں میں مزید اضافے کی توقع کی جاتی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں ذخیرۂ الفاظ اور جملوں کی ساخت کی جس درجہ بندی Grading کی بات کہی گئی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ این سی ای آر ٹی میں پہلی سے پانچویں جماعت کے لیے مادری یا بنیادی زبان اردو کی نصابی کتابیں ابھی تیاری کے مختلف مرحلوں میں ہیں اس لیے ان کے بارے میں اظہار خیال قبل از وقت ہوگا۔ البتہ این سی ای آر ٹی کے علاوہ کوئی اور ادارہ ہمارے علم میں نہیں ہے جہاں اردو کی نصابی کتابوں کی بنیاد الفاظ اور اظہار کے سانچوں کی مرحلہ وار درجہ بندی پر کی گئی ہو۔ یہ کام اردو زبان کی تدریس کے لیے نہایت اہم اور مختلف اداروں کے باہمی تعاون کا طلب گار ہے۔ این سی ای آر ٹی ایک قومی ادارہ ہے جس کے پیش نظر پورا ملک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علاقائی ضرورتوں کے پیش نظر بھی ایسی مرحلہ وار درجہ بندی کی جائے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ابتدائی تعلیم کا دوسرا مقصد گنتی سیکھ لینا ہے۔ یعنی بچے کو حساب کے چار بنیادی قاعدوں کے استعمال میں واقفیت حاصل ہو اور وہ اپنی سماجی زندگی کے عملی مسائل حل کرنے کا اہل ہو سکے۔ اس کی مزید وضاحت پیراگراف ۲ او ۴ میں اس طرح کی گئی ہے:

"ابتدائی مرحلے پر بچے کو گنتی، حساب کے بنیادی طریقوں اور ان کی بنیادی خصوصیات سے متعارف کرایا جانا چاہیے۔ لمبائی، چوڑائی، وقت، رقبہ اور گنجایش کے تصورات اور انھیں ناپنے کے پیمانوں سے واقفیت پیدا کی جانا چاہیے۔ بچے کو اقلیدسی شکلوں اور الجبرا کی علامتوں کے ابتدائی تصورات سے بھی مانوسیت پیدا ہونی چاہیے اس مرحلے پر حساب کے بنیادی طریقوں کے روزمرہ کے مسائل میں استعمال کو اہم جگہ ملنا چاہیے۔"

مندرجہ بالا پیراگراف میں ریاضی کے جن طریقوں اور تصورات سے واقف کرائے جانے پر زور دیا گیا ہے وہ تبادلۂ خیال کی مناسب صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں اس طرح تعلیم کے اس دوسرے مقصد کا پہلے مقصد یعنی مناسب حد تک گفتگو اور تحریر کے ذریعے تبادلۂ خیال کی سطح تک زبان کی تعلیم سے گہرا تعلق ہے اور اسی لیے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ زبان کی تدریس محض ایک مضمون کے

طور پر نہیں بلکہ طلبہ کی کلّی تربیت کے ایک لازمی جزو کے طور پر کی جانی چاہیے۔ گویا زبان کی تعلیم ریاضی کی تعلیم اور دیگر مضامین کی تدریس سے گہرے طور پر مربوط ہے پھر بھلا ابتدائی دو جماعتوں میں ریاضی کی تعلیم کیسے ہو؟ اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ ابتدائی تعلیم کے پہلے دو برسوں میں ریاضی زبان کے ذریعے اور زبان ریاضی کے ذریعے سکھائی جائے۔ چنانچہ دہلی کے اسکولوں میں، این سی ای آر ٹی کی تیار کردہ ریاضی کی جو متعدد رنگوں میں چھپی ہوئی کتاب پڑھائی جارہی ہے وہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ مثلاً اس کتاب کے پہلے صفحہ پر "پیاسے کوے" کی کہانی سے متعلق تصویر دی گئی ہے جسے دکھا کر استاد، ایک کوّے، ایک گھڑے سے متعلق سوال کر سکتا ہے۔ متعلقہ کہانی اس طرح سنا سکتا ہے کہ اس میں ایک کا ہندسہ بار بار سننے کو ملے۔ پھر وہ اردگرد کی ایسی چیزوں کی طرف بچّے کی توجہ مبذول کرا سکتا ہے جس سے ایک کا تصور بچّے کے ذہن میں پوری طرح واضح ہو جائے۔ اسی طرح ایک سے پانچ تک کے اعداد سے واقف کرنے کے لیے مشہور کہانیاں، مقولوں وغیرہ کو تصویر کی شکل میں دیا گیا ہے ساتھ ہی اس کی بھی گنجایش رکھی گئی ہے کہ استاد تاریخ اور ہندوستانی تہذیب جیسے مضامین سے بھی استفادہ کر سکے۔ مثلاً ۳ کا ہندسہ کے ساتھ بندروں کی تصویر دی گئی ہے جو گاندھی جی کے تین مشہور مقولوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اب اگر استاد چاہے تو وہ ایسے موقع پر بچے کو گاندھی جی اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کے کردار سے بھی واقف کرا سکتا ہے ——— گویا ایک طرف تو گرد و پیش سے سیکھنے کے عمل پر زور دیا جارہا ہے اور ساتھ ہی زبان کی ترقی پیش نظر ہے تو دوسری طرف مشہور کہانیوں، مقولوں اور تاریخ و ہندوستانی تمدن سے واقفیت کی گنجایش ریاضی کی تدریس کے ساتھ نکالی جارہی ہے۔

مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے پڑھانے کی یہی کوشش ان کتابوں میں بھی نظر آتی ہے جنھیں این سی ای آر ٹی نے ماحول کے ذریعے تعلیم کے نام سے دو۔ دو حصّوں میں مرحلہ وار شائع کیا۔ ان میں سے ہر ایک مرحلے کے لیے ایک حصّہ ماحول کے ذریعے سماجی علوم کی تعلیم پر مبنی ہے اور دوسرا ماحول کے ذریعے جنرل سائنس کی تعلیم پر مبنی ہے جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے ان کتابوں میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ بچّے اپنے گرد و پیش سے سیکھیں مثلاً اپنے اردگرد کی چیزوں کی فہرست بنانا یا گھر میں استعمال ہونے والے برتنوں کی فہرست بنانا یا گھر میں

پکائی جانے والی سبزیوں کا چارٹ بنانا اور ایسے بہت سے اسباق جو بچے کی مشاہدے کی قوت کو بڑھانے اور انھیں خود سیکھنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ تدریسی مواد تیار کرتے وقت ان مقاصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے اور وہ نصابی اور زائد از نصابی کتابوں کا جزو بنے ہیں۔

الفاظ اور جملوں کی ساخت کی جس مرحلہ وار درجہ بندی کی بات ابھی کچھ دیر قبل کہی گئی ہے اس کا تعلق نہ صرف اردو بحیثیت ایک مضمون کے پڑھانے سے ہے بلکہ مختلف مضامین سے بھی۔ مثلاً یہ بات طے ہونی چاہیے کہ پہلی سے پانچویں تک مختلف مضامین کی تدریس کے لیے الفاظ کا استعمال کس قسم کا ہو اور اس درجہ بندی کی بنیاد کس بات پر ہو؟ اس قسم کی مرحلہ وار اور مضامین کے اعتبار سے درجہ بندی کی کمی کی وجہ سے کئی قسم کی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں این سی ای آر ٹی سے اردو میں شائع ہونے والی مختلف مضامین کی نصابی کتابیں اور زائد از نصابی کتابیں ترقی اردو بورڈ اور این سی ای آر ٹی کے درمیان تعاون کی اسکیم کے تحت منظر عام پر آتی ہیں کتاب کا مسودہ پہلے این سی ای آر ٹی میں انگریزی زبان میں تیار ہوتا ہے پھر ترقی اردو بورڈ، این سی ای آر ٹی کے لیے اس کا اردو میں ترجمہ کرواتا اور ترجمے کے اخراجات خود برداشت کرتا ہے۔ یہ ترجمہ این سی ای آر ٹی کے ذریعے چھاپا اور بیچا جاتا ہے الفاظ اور جملوں کی ساخت کی مرحلہ وار اور مضمون کے اعتبار سے درجہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے زبان کے مشکل ہو جانے کا خطرہ تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی مترجم ایک ہی کتاب میں انگریزی کی ایک ہی اصطلاح کے لیے الگ الگ صفحات پر اردو کی الگ الگ اصطلاحات کا انتخاب کرتا ہے۔ مترجم کی یہ بے راہ روی مسودے کی اڈیٹنگ کو دشوار بنا دیتی ہے اور اگر اڈیٹر کی نگاہ چوک جائے تو طالب علم اور استاد دونوں کے لیے الجھن کا سبب بن سکتی ہے۔ واضح ہو کہ مسودہ این سی ای آر ٹی پہنچنے سے قبل ترجمے کے علاوہ ویٹنگ کے مرحلے سے بھی گزرتا ہے۔ اور ترقی اردو بورڈ کے مترجم اور ویٹر زیادہ تر وہ حضرات ہیں جو اسکول یا کالج و یونیورسٹی میں اسی مضمون کی تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ـــ یہ بے راہ روی اس لیے بھی عام ہے کہ انگریزی کی بعض اصطلاحات کے لیے اردو میں ایک سے زیادہ اصطلاحات مروج ہیں۔ اب جبکہ این سی ای آر ٹی

پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک کی سارے مضامین کی تقریباً تمام کتابیں چھاپ چکا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں میں مترجم کے ذریعے استعمال کی گئی۔ اصطلاحات کی معیاربندی کی جائے اور یہ طے کیا جائے کہ انگریزی کی کس اصطلاح کے لیے اردو میں کون سی اصطلاح استعمال کی جانی چاہیے۔ یہ کام اردو اداروں کی فوری توجہ کا مستحق ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو ہے۔ این سی ای آر ٹی کے ذریعے شائع کردہ اردو کتابوں کی اصطلاحات کے مشکل ہونے کا شکوہ وقفے وقفے سے کیا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں سماجی علوم کی اصطلاحات کے مشکل ہونے کی شکایت جتنی کم ہے سائنس کی اصطلاحات کے مشکل ہونے کی شکایت اتنی ہی زیادہ ہے۔ کہیں اس کی ایک وجہ یہ تو نہیں کہ سماجی علوم کی ہمارے ہاں ایک مسلسل روایت رہی ہے اور اس کے اصطلاحات سے ہم قدرے مانوس ہیں اور سائنسی اصطلاحات سے اسی قدر غیر مانوس، اگرچہ زیر نظر مضمون کا دائرہ ابتدائی تعلیم ہے لیکن وضاحت کے خیال سے اس کی ایک انتہائی صورت بطور مثال پیش کی جارہی ہے۔ گیارہویں اور بارہویں جماعت کے لیے ریاضی کی پانچویں کتاب ابھی چند دن قبل چھپی ہے۔ اس کتاب میں استعمال کی گئی چند اصطلاحات، انگریزی مترادفات کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ معکوس مثلثاتی تفاعلات کے مشتقات Derivative of Inverse Trigonometric Function

۲۔ کسی خط کے مساواتوں کی غیر متشاکل صورت سے متشاکل صورت میں تحویل۔

Tranformation of unsymmetrical form to the symmetrical form of Equation of a line.

۳۔ کسی خط کی شرطِ ہم مستویت Condition for the co-planerit of a line.

اگر اردو کی یہ اصطلاحات مشکل ہیں تو کیا انگریزی کی وہ اصطلاحات آسان ہیں جن کے لیے اردو اصطلاحات کی تشکیل عمل میں آئی ہے؟ محض عام انگریزی داں ہی نہیں انگریزی زبان وادب کا پروفیسر بھی اس پر مصر نہیں ہوتا کہ ریاضی کی اصطلاحات اس کی سمجھ میں ضرور آنی چاہئیں۔ اور اگر کسی وجہ سے اسے سمجھنے کی ضرورت ہی پیش آجائے وہ اسے محض لسانیات کے ذریعے سمجھنے کے بجائے ان تصورات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا جن پر اس اصطلاح کی بنیاد ہے۔ پھر اردو زبان وادب کے ایک استاد کو یہ لاگ کیوں لگی ہے کہ وہ ریاضی کے تصورات سے واقف ہوئے بغیر اصطلاحات کا

مفہوم سمجھ لے ؟

اس بات کو مزید ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ ریاضی کی جو کتاب ان دنوں دہلی کے اسکولوں میں پڑھائی جا رہی ہے اس سلسلے کی تیسری کتاب میں جو تیسری جماعت کے لیے ہوگی ہلکعب نما، مخروطی، مربع نما شکلوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اب اگر ملکعب، مخروط اور مربع کی اصطلاح تیسری جماعت کے طالب علم کے لیے دشوار ہے تو کیا ان کا انگریزی نعم البدل آسان ہے ؟ یہاں تصورات کے علاوہ ایک اور مسئلہ معیار کا بھی ہے ۔ این سی ای آر ٹی نے ایک ماڈل نصاب تیار کیا اور اسی کے مطابق ماڈل کتابیں بھی تیار کی ہیں ۔ تمام صوبوں کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے معیار اور اپنی ضرورت کے مطابق ان کتابوں کو جوں کا توں پڑھائیں یا حسبِ ضرورت تبدیل کرلیں ۔ این سی ای آر ٹی کی ان ماڈل کتابوں میں ماڈل استاد کا بھی تصور پنہاں ہے جو مناسب طور پر اس کام کے لیے تربیت یافتہ ہوں گے ۔ اگر اساتذہ اُن تصورات سے ہی ناواقف ہیں تو اس میں قصور این سی ای آر ٹی کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جن پر اساتذہ کی نوکری حاصل کرنے سے قبل اور نوکری کے دوران تربیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ اردو میڈیم اسکولوں کی حد تک اردو اداروں کو بھی اس سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے ۔ اردو زبان و ادب کے اساتذہ سے اردو کے ہر مسئلے میں استفادہ کرنے کا رواج تو بہت عام ہے کم از کم اس کام کی حد تک ان لوگوں کو بھی پوچھ لینا نامناسب نہ ہوگا جو ٹریننگ کالجوں میں مختلف مضامین سے متعلق ہیں اور ایک عرصے سے اساتذہ کی تربیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ۔

املا اور تلفظ کا مسئلہ

گزشتہ دس برس میں املا کے تعین کا مسئلہ اردو دنیا میں بڑی شدت سے زیر بحث رہا ہے ۔ رشید حسن خاں کی دو کتابوں "اردو املا" اور "اردو کیسے لکھیں" نے اس بحث کے لیے بنیاد فراہم کی ۔ ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کیں اور اس طرح وہ کام جو انجمن ترقی اردو نے آزادی سے قبل ادھورا چھوڑ دیا تھا پھر سے غور و فکر کا موضوع بنا ۔ ان سب کے باوجود عملاً اردو میں ایک ہی لفظ کو طرح طرح سے لکھنے کا رواج باقی ہے ۔ اور یہ نصابی کتابوں کی

تیاری میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ نصابی کتابوں کی حد تک یہ بات بہت ضروری ہے کہ جو بھی املا اختیار کیا جائے اسے پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک برتا جائے تاکہ طالب علم کسی قسم کی دشواری محسوس نہ کرے۔ این سی ای آر ٹی میں اس مسئلے کو اس طرح حل کیا گیا ہے کہ بڑی حد تک ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات کو اپنا لیا گیا اور اس پر صد فی صد عمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

املا کی طرح تلفظ کا مسئلہ بھی نصابی کتابوں اور خاص طور پر ابتدائی جماعت کی کتابوں کی تیاری کے وقت سامنے آتا ہے۔ ایک ہی لفظ مختلف علاقوں میں مختلف طرح سے بولا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی شہر میں ایک لفظ کو کئی طرح سے ادا کرنے والے مل جائیں گے۔ مثال کے طور پر خود شہر دہلی کے مختلف اسکولوں میں پہاڑہ کئی طرح سے پڑھایا جاتا ہے۔ یہ بات ہمیں تب معلوم ہوئی جب پہلی اور دوسری کی حساب کی کتاب کا اردو مسودہ اڈیٹنگ کے مرحلے میں تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ این سی ای آر ٹی ایک قومی ادارہ ہے جس کی تیار کردہ کتابوں کا ٹارگٹ پورے ملک میں پھیلی ہوئی اردو آبادی ہے۔ ایسے میں تلفظ کی معیار بندی کس بنیاد پر ہو؟ اس تلفظ کو اپنایا جائے جو کسی خاص تہذیبی مرکز میں مرجح ہے یا اسے جو قواعد کی رو سے درست ہے؟ یہ تعین اور پھر ابتدائی جماعت کی کتابوں میں ضروری حد تک اعراب کا لگایا جانا اس لیے ضروری ہے کہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی اردو آبادی میں کسی حد تک یکسانیت پیدا کی جا سکے۔ ضرورت اس مسئلے پر بھی غور کرنے کی ہے کہ کیا موجودہ دور میں جب تہذیبی مراکز بدل گئے ہیں یا ان کی تعداد بڑھ کر ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی ہے کیا کسی ایک تہذیبی مرکز کی زبان کو معیاری مان کر تلفظ کا تعین کیا جا سکتا ہے؟ اس مسئلے پر غور کرتے وقت یہ تاریخی حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تلفظ کے مسئلے پر دہلی اور لکھنؤ دونوں تہذیبی مراکز کے درمیان شدید اختلاف رائے رہا ہے اور خود دہلی میں مختلف طبقوں اور محلوں کی زبان میں اختلاف رہا ہے ورنہ فرہنگ آصفیہ کے مؤلف پر اعتراض کی گنجائش کہاں سے پیدا ہوتی۔ دہلی یا لکھنؤ کے جس طبقے کی زبان کو معیار مانا جاتا تھا وہ طبقہ اب اپنی اس ہیئت میں کہاں موجود ہے؟ اور کیا آج جو لوگ اردو پڑھ لکھ رہے ہیں وہ اسی طبقے کے نمائندے ہیں؟ اس مسئلے کا حل کیا جانا یوں تو سب کے لیے اہمیت رکھتا ہے لیکن درسیات کے

معاملے میں یہ معیار بندی انتہائی اہم ہے۔

کتابت وطباعت

اردو کی نصابی کتابوں کی معیار بندی کے سلسلے میں ایک اہم دشواری کتابت اور اس طریقۂ کار کی وجہ سے بھی درپیش ہے مثال کے طور پر رومن رسم خط میں عام طور سے انگریزی زبان سکھانے والی کتابوں کے بارے میں دشواری، پہلی جماعت میں حروف کی ساخت سے واقف کرانے کا مسئلہ ہوتا ہے، اس لیے ۱۸ یا ۲۴ پوائنٹ کا ٹائپ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری یا تیسری جماعت میں جملے کی شکل میں الفاظ کا استعمال ہوتا ہے اس لیے ٹائپ کا پوائنٹ سائز گھٹا کر ۱۴ یا ۱۸ کر دیا جاتا ہے اور V - IV جماعتوں کے لیے یہ سائز گھٹ کر ۱۲ پوائنٹ کا رہ جاتا ہے اردو میں اتنی قطعیت کے ساتھ سائز کا تعین خاصا دشوار ہے۔ یہاں پوائنٹ جیسی سائنٹفک تقسیم کے بجائے مختلف سائز کے نب سے حروف کے سائز کا تعین کرنا پڑتا ہے چنانچہ کاپی اڈیٹنگ کے ساتھ سائز مارک لگانا بڑے جوکھم کا کام ہے۔ نتیجہ ہے کہ عام طور سے اردو کی کتابوں میں پہلی جماعت سے بتدریج سائز کا گھٹنا اس طرح عمل میں نہیں آتا جس طرح کہ ہونا چاہیے۔ جب متن کے حروف کے سائز کا تعین ہی سائنٹفک نہیں ہو پاتا تو جلی سرخی یا ذیلی سرخی کا تعین بھلا کس بنیاد پر ہو بعض اوقات جلی سرخی متن سے تین گنا بڑی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جبکہ دگنا سائز زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔

ایک اور مسئلہ بین السطور کا ہے۔ میری مراد ہے دو سطروں کے درمیان وہ فاصلہ جس کی وجہ سے ان سطروں کے درمیان ایک سفید لکیر سی واضح طور پر نظر آئے اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ کچھ تو رسم خط کی دشواری اور بڑی حد تک کاتبوں کی لاپروائی کے نتیجے میں دونوں سطروں کے حروف ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کاف یا گاف کا مرکز اوپر کی سطر سے چھیڑ خانی کر رہا ہوتا ہے تو میم کا دنبالہ نیچے کی سطر کو چھیڑ رہا ہوتا ہے۔ یعنی اگر دو سطروں کے درمیان کوئی لکیر کھینچی جائے تو وہ مرکز کو کاٹتی ہوئی گزرے گی یا دنبالے کو۔ لفظوں کے سلسلے میں بھی بے راہ روی عام ہے۔ ابتدائی جماعتوں کی نصابی کتابوں میں یہ مسائل بھیانک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سے بھی بھیانک مسئلہ اس فصل کے تعین کا ہے جو مختلف الفاظ کے درمیان ہونا چاہیے اور جس کی وجہ سے

ایک لفظ کے سارے حروف کو مل کر ایک یونٹ کی طرح نظر آنا چاہیے۔ ہاتھ سے مشین جیسا Perfection تو ممکن نہیں پھر بھی تجربہ ہے کہ ہاتھ روک کر احتیاط سے لکھنے والے کاتب بھی عنقا ہیں۔ اور ان سب کا نتیجہ استاد اور طالب علم کو ایک ساتھ بھگتنا پڑتا ہے جب طالب علم ایک لفظ کے کسی حرف کو دوسرے لفظ سے متعلق سمجھ لیتا ہے یا ایک سطر کے اعراب کو دوسری سطر کے حرف سے متعلق تصور کر بیٹھتا ہے ___ ہماری مجبوری یہ ہے کہ کاتب بار بار کی ہدایت کے باوجود خود کو معذور پاتا ہے اور مطلوبہ معیار قائم نہیں ہو پاتا ہے۔ گزشتہ دنوں جب اردو زبان کی کتابوں کا مسئلہ درپیش ہوا تو یہ مسائل پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ کے ماہرین کے سامنے زیادہ شدت سے ابھرے۔ تیسری جماعت کی جو کتاب ان دنوں پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ میں زیر طباعت ہے اس میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ایک معیار قائم کیا جا سکے۔ شاید دوسری اور پہلی جماعت کی کتابوں میں صحیح معیار بندی ہو پائے۔ این سی ای آر ٹی کے پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ میں طباعت کے ماہرین نصابی کتابوں کے تناظر میں ان مسائل کے حل ڈھونڈھنے میں مصروف ہیں لیکن یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ ہمہ گیر ہے اور اردو زبان و ادب اور اس کی تعلیم سے متعلق اداروں کی فوری توجہ کا محتاج ہے۔

مجتبیٰ حسین

این۔سی۔اِی۔آر۔ٹی۔ میں نصابی کتابوں کی تیاری

(مڈل، سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری کی سطح تک)

سب سے پہلے تو میں ارباب اردو اکیڈمی دہلی کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اردو کے تعلیمی مسائل پر ایک ایسے سیمینار کا انعقاد کیا ہے جس کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ایک نئی قومی تعلیمی پالیسی تشکیل پا رہی ہے، یہ ضروری ہے کہ اردو والے اپنے گریبانوں میں جھانکیں۔ (یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ ہم لوگ ایک عرصے سے اپنے گریبانوں میں کم اور دوسروں کے گریبانوں میں زیادہ جھانکنے لگے ہیں)

میں یہاں اپنی کوتاہی اور کم علمی کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نہ اردو کا استاد ہوں اور نہ ہی کوئی ماہر تعلیم ہوں۔ اردو کا ایک ادنیٰ سا مزاح نگار اور صحافی ہوں اور چونکہ کسی زمانے میں غلطی سے ایک پرنٹنگ پریس کا مینیجر رہ چکا ہوں اسی لیے طباعت اور اشاعت کے مسائل سے بھی جائز یا ناجائز سا تعلق رکھتا ہوں۔ میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ پہلا موقع ہے جب کہ میں این سی ای آر ٹی کے ایک عہدیدار کی حیثیت سے کسی تقریب میں روشناس ہو رہا ہوں ورنہ میں اپنی شناخت کو حتی الامکان خفیہ ہی رکھتا ہوں۔ دو تین مرتبہ بعض خانگی محفلوں میں میرا تعارف غلطی سے این سی ای آر ٹی کے حوالے سے کرایا گیا تو اہل خانہ سے لے کر اہل خانہ کے بال بچے تک میرے پیچھے پڑ گئے کہ یہ آپ کی کتابوں میں کیا ہوتا ہے؟ ان کا بوجھ زیادہ کیوں ہوتا ہے؟ ان کی بائنڈنگ کیوں خراب ہوتی ہے؟ کتابیں وقت پر کیوں نہیں آتیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ دو ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ میزبان کو جب این سی ای آر ٹی سے

میرے تعلق کا پتہ چلا تو انھوں نے کم از کم میری حد تک مہمان نوازی سے ہاتھ روک لیا۔ اس کے بعد سے میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنی شناخت لوگوں پر ظاہر نہ ہونے دوں۔ اب میرے دوست پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بھری محفل میں مجھے کھڑا کیا ہے اور مجھ سے پوچھ رہے ہیں " بتاؤ دیوان غالب کس نے لکھا ہے "؟

اس سوال کے جواب میں، اتنا ہی کہوں گا کہ دیوان غالب کم از کم میں نے نہیں لکھا اور یہ سچ بھی ہے۔ ہاں اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ این سی ای آر ٹی نے اردو کی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں اب تک کیا کیا کام کیا ہے۔ اردو میں خاموش خدمت کرنے کا رواج اب چونکہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اگر کوئی ادارہ خاموش خدمت کرتا ہے تو وہ نہ صرف گمنام رہ جاتا ہے بلکہ اپنے کیے کی سزا بھی پاتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ این سی ای آر ٹی کے ساتھ بھی کم از کم یہی ہوا ہے۔

۱۹۷۴ء سے پہلے قومی سطح پر اردو کی نصابی کتابوں کی تیاری کا کوئی انتظام موجود نہیں تھا۔ مختلف ریاستیں اپنے طور پر اردو میڈیم اسکولوں کے لیے نصابی کتابیں تیار کر رہی تھیں اور اب بھی کر رہی ہیں، خاص طور پر حکومت مہاراشٹر اور بہار نے اس خصوص میں خاصا کام کیا ہے۔ لیکن تب بھی قومی سطح پر کوئی ادارہ ایسا نہیں تھا جو کل ہند معیار اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر اردو میں مختلف مضامین کی کتابیں تیار کرے۔ ۱۹۷۲ء میں این سی ای آر ٹی نے ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے ایک اسکیم منظور کی جس کے تحت ترقی اردو بورڈ سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ این سی ای آر ٹی کی مختلف مضامین سے متعلق کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرے اور این سی ای آر ٹی نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ ان کی طباعت، اشاعت اور تقسیم کا انتظام کرے گی۔ یہ اسکیم ۱۹۷۲ء کے اوائل میں منظور ہوئی تھی لیکن ۱۹۷۴ء تک چونکہ این سی ای آر ٹی میں اردو جاننے والا اسٹاف موجود نہیں تھا اس لیے اس اسکیم کو روبہ عمل لانے میں تاخیر ہوئی۔ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں این سی ای آر ٹی میں اردو جاننے والے دو تین اصحاب کا تقرر عمل میں آیا اور یہیں سے اردو کتابوں کی اشاعت کا باضابطہ آغاز ہوا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ این سی ای آر ٹی صرف تین زبانوں یعنی ہندی، انگریزی اور اردو میں کتابیں شائع کرتی ہے۔ کوئی بھی کام جب شروع ہوتا ہے تو اس میں مشکلات بھی پیش آتی ہیں

عملہ اور وسائل کی کمی کے باوجود پچھلے ایک دہے میں این سی ای آر ٹی نے اردو کی جملہ ۱۱۹ کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں سے ۹۷ کتابیں، نصابی کتابیں ہیں، ۱۲ زائد نصابی کتابیں اور ۱۰ کتابیں نان فارمل ایجوکیشن سے متعلق ہیں۔

مڈل اسکول کی سطح پر یعنی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لیے ریاضی، سائنس تاریخ اور جغرافیہ کی ساری کتابیں این سی ای آر ٹی نے اردو میں شائع کردی ہیں۔ ثانوی سطح پر نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات معاشیات کی ساری کتابیں شائع کردی گئی ہیں۔ اعلا ثانوی سطح پر بھی گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کے لیے نفسیات کی دو کتابوں کو چھوڑ کر باقی ساری کتابیں شائع ہوگئی ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ان کتابوں میں سے ۴۶ کتابیں ایسی ہیں جن کے دو یا دو سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ این سی ای آر ٹی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب بھی کسی ریاست نے این سی ای آر ٹی سے اردو کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں مدد مانگی تو این سی ای آر ٹی نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنا دست تعاون آگے بڑھایا ہے۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں جموں و کشمیر بورڈ آف اسکول ایجوکیشن نے جب این سی ای آر ٹی کی شائع کردہ اردو کتابیں اپنے نصاب میں شامل کیں تو بورڈ نے یہ خواہش کی کہ این سی ای آر ٹی ان کے لیے بھی یہ کتابیں چھاپ دے۔ چنانچہ این سی ای آر ٹی نے جموں اینڈ کشمیر بورڈ آف اسکول آف ایجوکیشن کے لیے ۲۲ ایسی نصابی کتابیں شائع کیں جن کی تعداد اشاعت ۸۵ ہزار سے لے کر ایک لاکھ ۳۰ ہزار تک تھی۔ پچھلے سال دہلی ایڈمنسٹریشن نے پہلی جماعت کی ریاضی سے متعلق کتاب اپنے نصاب میں شامل کی تو این سی ای آر ٹی نے نہایت کم وقت میں انھیں چھ ہزار کتابیں چھاپ کر دیں۔

این سی ای آر ٹی کی اردو کتابوں کی قیمت کے بارے میں بھی یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ ہندوستان کے کسی اور ادارے نے اردو کتابوں کی قیمت کے سلسلے میں وہ رعایت نہیں دی ہے جو این سی ای آر ٹی نے دے رکھی ہے۔ سرکاری اداروں میں کتاب کی قیمت طے کرنے کا فارمولہ عموماً یہ ہے کہ کتاب کی تیاری پر جو اصل لاگت آتی ہے اُس کی ڈھائی گنا یا تین گنا قیمت رکھی جائے۔ این سی ای آر ٹی نے ابتدا میں جب اس فارمولے کی رُو سے اردو کتابوں کی قیمت

مقرر کی تو پتہ چلا کہ اردو کتابوں کی قیمت ہندی اور انگریزی کتابوں کے مقابلے میں دو ڈھائی گنا زیادہ مقرر ہو رہی ہے۔ گویا یہاں داڑھی سے مونچھیں بڑی ہونے لگی تھیں۔ انگریزی اور ہندی کی نصابی کتابیں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں جب کہ اردو کی نصابی کتابوں کی تعداد اشاعت مڈل اسکول کی سطح تک پانچ ہزار اور سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح تک دو ہزار ہوتی ہے۔ اس مشکل صورت حال سے نمٹنے کے لیے این سی ای آر ٹی کی مجلس مالیہ نے ۱۹۷۶ء میں یہ طے کیا کہ اردو کی نصابی کتابوں کی تیاری پر چاہے کتنی ہی لاگت کیوں نہ آئے اُن کی قیمت اتنی ہی رکھی جائے جتنی کہ ان کی متبادل انگریزی اور ہندی نصابی کتابوں کی ہوتی ہے۔ این سی ای آر ٹی نے یہ بھی طے کیا کہ انگریزی اور ہندی نصابی کتابوں کے دوسرے ایڈیشنوں کی اشاعت سے جو فائدہ ہوتا ہے اُس سے اردو کتابوں کی اشاعت سے ہونے والے نقصان کی پابجائی کی جائے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے ایسی کوئی اور ادارہ نہیں دے گا۔ این سی ای آر ٹی کے اس اقدام کی جتنی ستایش کی جائے کم ہے۔

یہ امر بھی ذہن نشیں کرنا ضروری ہے کہ این سی ای آر ٹی کی اردو نصابی کتابیں، انگریزی یا ہندی نصابی کتابوں کے مقابلے میں ایک سال تا دو سال کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جونہی کوئی نصابی کتاب انگریزی یا ہندی میں شائع ہوتی ہے اسے ترجمے کی غرض سے ترقی اردو بورڈ کو روانہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ترجمے میں کچھ وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔ پھر یہ کتاب، کتابت اور طباعت کے مراحل سے گذرتی ہے، تاہم ہماری پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ انگریزی اور اردو کتابوں کی اشاعت میں زیادہ فصل نہ رہے۔

این سی ای آر ٹی نے جب مختلف مضامین کی کتابیں اردو میں فراہم کر دیں تو یہ بھی طے کیا کہ اردو زبان کی تعلیم سے متعلق کتابیں بھی پہلی جماعت سے لے کر بارھویں جماعت تک تیار کی جائیں۔ اس سلسلے میں کام جاری ہے اور امید ہے کہ اگلے سال تک اس سلسلے کی چار کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اگرچہ مختلف ریاستی حکومتیں اپنے طور پر اردو زبان و ادب سے متعلق کتابیں شائع کر رہی ہیں لیکن قومی سطح پر این سی ای آر ٹی وہ واحد ادارہ ہے جس نے اس سمت میں

پیش قدمی کی ہے۔

این سی ای آر ٹی کی کتابوں کی تقسیم کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا چاہوں گا ایک معاہدے کے مطابق حکومت ہند کا پبلیکیشن ڈویژن ہماری ساری کتابوں کا تقسیم کار ہے۔ اردو کی نصابی کتابیں بھی یہی ادارہ تقسیم کرتا ہے۔ پبلیکیشن ڈویژن نے این۔سی۔ای آر ٹی کو مطلع کیا ہے کہ دہلی کے پانچ بک سیلرس اُس سے اردو کی کتابیں حاصل کرتے ہیں۔

این سی ای آر ٹی نے پچھلے دس گیارہ برسوں میں اردو کے لیے جو کام انجام دیا ہے اُس کا یہ ایک مختصر ساخاکہ ہے۔ این سی ای آر ٹی کے نصاب اور زبان وغیرہ کے تعلق سے میرے رفیق کار ڈاکٹر قیصر شمیم الگ سے مقالہ پیش کر رہے ہیں اس لیے میں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ تاہم قومی سطح پر اردو کی نصابی کتابوں کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں میرے بعض دلچسپ تجربات بھی ہیں جنھیں میں بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

چار پانچ سال پہلے جب حکومت جموں وکشمیر نے مڈل اسکول کی سطح تک این سی ای آر ٹی کی تیار کی ہوئی اردو کتابوں کو اپنے ہاں لگانے کا فیصلہ کیا تو ہم نے سوچا کہ ہماری محنت کا پھل مل گیا ابھی ہم نے اس محنت کا پھل چکھا بھی نہیں تھا کہ جموں اینڈ کشمیر بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کے ایک عہدیدار ایک دن ہماری چھٹی جماعت کی سائنس سے متعلق ایک کتاب کو لے کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے "اس کتاب میں سوٗر بہت ہیں اور ہمیں سوٗروں کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی کشمیر میں یہ کھائے نہیں جاتے۔" میں نے کہا "بھلے ہی کھائے نہ جاتے ہوں وہاں کسی نہ کسی شکل میں پائے تو جاتے ہوں گے۔" بولے "اگر پائے بھی جاتے ہوں تو ہم انھیں کتاب میں رکھنا نہیں چاہتے۔" میں نے کہا "آپ بجا فرماتے ہیں لیکن میرا کام صرف کتابوں کو چھاپنا ہے۔ ہمارے سائنس ڈپارٹمنٹ نے جانوروں کی نگہداشت والے سبق میں ان سوٗروں کو شامل رکھا ہے۔ یہ سوٗر سائنس ڈپارٹمنٹ کے ہیں اور جب تک سائنس ڈپارٹمنٹ کتاب میں سے ان سوٗروں کو نکالنے کی اجازت نہ دے دے میں اپنے بل بوتے پر ان سوٗروں کو نکالنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔"

کشمیر بورڈ آف ایجوکیشن اور ہمارے سائنس ڈپارٹمنٹ کے بیچ مراسلت چلتی رہی اور بالآخر فیصلہ سوٗروں کے خلاف صادر ہوا۔ میں کتاب میں سے سوٗروں کو نکال کر اطمینان کا لمبا

سانس لینے ہی والا تھا کہ ایک دن یہی عہدیدار اسی کتاب کے سلسلے میں بھاگے بھاگے آئے۔

میں نے پوچھا "حضرت! اب کس کو کتاب بدر کرنے آئے ہیں؟"

بولے "قبلہ! آپ کی کتاب میں یہ جو تولیدی نظام سے متعلق سبق ہے وہ ہمیں نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "اس میں کیا قباحت ہے؟۔ تولیدی نظام تو آپ کے ہاں بھی ہوتا ہوگا"

بولے "کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ تولیدی نظام نہ ہوتا تو ہمارے ہاں ہزاروں کی تعداد میں نصابی کتابوں کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔"

میں نے کہا "جب آپ کے ہاں تولیدی نظام ہوتا ہے تو اس کا ذکر بھی کتاب میں رہنے دیجیے۔ بچّوں کو اس بارے میں معلومات فراہم ہو جائیں گی۔"

بولے "جی نہیں! تولیدی نظام کے بارے میں ہمارے طلبہ خود مکتفی ہیں۔ آپ کی معلومات کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔"

آخر کار سائنس ڈپارٹمنٹ نے مجھے حکم دیا کہ میں تولیدی نظام کو کتاب سے نکال دوں۔ کتاب کو سؤروں اور تولیدی نظام سے پاک کرنے کے بعد میں اسے طباعت کے لیے بھیج ہی رہا تھا کہ ایک دن انہی عہدیدار نے کہا "حضور! ایک کرم اور کر دیجیے"

میں نے کہا "فرمائیے۔"

بولے "اس کتاب میں ایک عدد کچھوا ہے اسے نکال دیجیے۔"

میں نے کہا "کچھوے سے آپ کو کیا تکلیف ہے۔ بیچارہ کچھوا ہی تو ہے۔ سؤر یا تولیدی نظام تو نہیں ہے۔ یوں بھی بے ضرر سا جاندار ہے۔"

بولے "آپ بجا فرماتے ہیں۔ بے ضرر سا جاندار ہے اسی لیے تو کشمیر میں پیدا نہیں ہوتا۔ جو چیز ہماری ریاست میں پیدا ہی نہ ہوتی ہو اسے کتاب میں رکھنے کا کیا فائدہ؟"

میں نے کہا "اگر آپ اسے کتاب میں نہ رکھیں گے تو کچھوے اور خرگوش کی مشہور کہانی بچّوں کو کیسے پڑھا سکیں گے؟"

بولے "ہمیں اس کہانی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بہت ہی بے ضرر سی کہانی ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو پھر اس کتاب میں سے ہاتھیوں کو بھی نکال دیجیے۔ کشمیر میں

ہاتھی کہاں ہوتا ہے؟
بولے ''ہاتھی بھلے ہی کشمیر میں نہ پایا جاتا ہو مگر مشہور جانور ہے''
میں نے کہا ''جانوروں کی شہرت کو کتاب میں اُن کی شمولیت کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ کب تک آپ ہاتھیوں کی شہرت کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔ کبھی کبھی مظلوم کا بھی ساتھ دینا چاہیے۔ کچھوا ایک مظلوم جانور ہے۔ اُسے کتاب میں جگہ نہ بھی ملتی ہو تو دی جانی چاہیے''۔ میں نے اس مسئلے پر ان سے کافی بحث کی اور بالآخر کچھوے کو کتاب میں اُس کا جائز مقام دلا کر ہی دم لیا۔ میں نے اپنے استدلال میں وزن پیدا کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ کتاب سے تولیدی نظام کو خارج کر کے آپ انسانوں کو تو اس کتاب سے نکال ہی چکے ہیں۔ جانوروں میں کم از کم کچھوے کو ہی کتاب میں رہنے دیجیے اور وہ بڑی مشکل سے اس بات کے لیے راضی ہوئے۔
میں نے صرف ایک ہی کتاب کے سلسلے میں پیش آنے والے تجربات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ دوسری کتابوں میں اور بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ اُن کا ذکر لے بیٹھوں گا تو یہ داستان ختم ہونے میں نہ آئے گی۔ میں نے یہ ذکر بھی صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کیا ہے کہ قومی سطح پر کتابوں کی تیاری کے وقت مقامی حالات اور تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ نصابی کتابوں کی زبان کا مسئلہ تو اور بھی پیچیدہ ہے۔
اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ این سی ای آر ٹی نے تعلیم کے جدید اصولوں کے تحت کتابوں کو تیار کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ابھی حال ہی میں اردو کی ایک نصابی کتاب میری نظر سے گذری تھی۔ جس میں ماں اپنے بیٹے کو دونّی دے کر کہتی ہے ''بیٹا یہ دونّی لے جاؤ بازار سے آٹا لے آ''۔ ہماری روزمرہ زندگی میں دونّی کا چلن کب کا ختم ہو چکا ہے مگر خدا کے فضل سے اردو کی نصابی کتابوں میں یہ اب تک چل رہی ہے۔ ایک طرف تو اس بات کا دُکھ ہوتا ہے لیکن دوسری طرف اس بات کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ ابھی اردو کی کتابوں میں دونّی میں آٹا مل جاتا ہے۔ ہمیں تو اب دو روپے میں بھی نہیں ملتا۔
ہمارے ہاں عموماً مقطع میں سخن گسترانہ بات ضرور آجاتی ہے۔ لہٰذا اس مضمون کے آخر میں مجھے بھی سخن گسترانہ بات کرنے کی اجازت دیجیے۔ میں یہ بات این سی ای آر ٹی کے عہدیدار کی

حیثیت سے نہیں اردو کے ایک ادنیٰ ادیب کی حیثیت سے کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں بازار میں اردو کی کوئی نصابی کتاب دستیاب نہیں ہوتی تو اردو والے اس کتاب کو حاصل کرنے کے لیے اس کے پبلشر سے ربط پیدا نہیں کرتے بلکہ سیدھے اخبار کے دفتر میں ایک مراسلے سمیت یا وزیر تعلیم کے پاس ایک میمورنڈم سمیت پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں کتاب کو حاصل کرنا ذیلی کام بن جاتا ہے اور اخبار میں اپنا نام چھپوانا یا اس بڑی شخصیت سے ملنا بنیادی کام کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مشکل یہ ہو گئی ہے کہ اردو کی خدمت کرنے والے اب کم ہوتے جا رہے ہیں اور اردو کی قیادت کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ حیرت کریں گے کہ این سی ای آر ٹی کی اردو کتابوں کی عدم دستیابی کے بارے میں تقریروں میں تو سننے کو بہت مل جاتا ہے لیکن آج تک این سی ای آر ٹی کے کسی عہدیدار کے نام اردو کے کسی بہی خواہ نے نہیں لکھا۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ این سی ای آر ٹی کی کتابوں کی تقسیم میں تقسیم کار عملے کی اردو سے عدم واقفیت کی بنا پر دشواریاں پیش آتی ہوں، لیکن یہ مسئلہ ایسا ہے جس کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ دو ایک بار ایک بک ڈپو کے مالک کتابوں کی عدم دستیابی کی شکایت لے کر میرے پاس آئے تھے اور اگر وہ اس محفل میں موجود ہوں تو گواہی دیں گے کہ انھیں بیشتر کتابیں اُسی وقت فراہم کر دی گئی تھیں۔

اردو کے ایک خاموش اور ادنیٰ خدمت گذار کی حیثیت سے میری گذارش صرف اتنی ہے کہ اردو والے مسئلوں کا حل ڈھونڈھنے کے لیے سروں کو جوڑ کے بیٹھیں، سروں کو توڑنے نہ بیٹھیں۔

خلیق انجم

ہندی داں اردو طلبہ کے تعلیمی نصاب کے مسائل

اردو ہندوستان کی واحد زبان ہے، جو کشمیر سے کنیا کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد اس زبان کے بولنے والے دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیل گئے ہیں اس لیے اس زبان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس کے سنو سے زائد اخبار اور رسالے تو انگلینڈ ہی سے شائع ہو رہے ہیں اس لیے ہندوستان سے باہر ایسے غیر ملکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اردو پڑھ رہے ہیں یا جنھیں اردو پڑھنے کی خواہش ہے۔

فلموں، مشاعروں — ریڈیو اور ٹی۔ وی پر گائی جانے والی غزلوں کی وجہ سے اردو ہندوستان کے غیر اردو دانوں میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ غیر اردو داں تعلیم یافتہ بالغ ہندوستانیوں میں اردو پڑھنے کے خواہشمند لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے کافی تعداد میں لوگ اردو پڑھتے بھی ہیں۔

ان لوگوں کو اردو پڑھانے کا ہم نے انتظام تو کیا ہے۔ کئی یونیورسٹیوں اور اردو اکیڈیمیوں نے اردو سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس شروع کر رکھے ہیں ایک دو یونیورسٹیوں کے مراسلاتی کورس بھی ہیں۔ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں تعلیم یافتہ لوگ اردو پڑھ رہے ہیں۔ اردو سکھانے کے کورس جہاں کہیں شروع کیے گئے ہیں اُن میں ایک چیز مشترک رہی ہے، وہ یہ کہ ایک کورس میں اگر سو طالب علم داخلہ لیتے ہیں تو شروع میں طالب علم بہت ذوق و شوق سے کلاس میں آتے ہیں لیکن کچھ ہی دن بعد طلبہ کی تعداد کم ہونی شروع ہوتی ہے اور کورس ختم ہونے تک یہ تعداد پچیس فیصدی

اور بعض اوقات اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ ہم لوگوں نے کبھی سنجیدگی سے اس پر غور نہیں کیا۔ میرے خیال سے اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض طالب علم شوق میں داخلہ تو لے لیتے ہیں، بعد میں اپنی مصروفیات یا گھر سے اسکول تک کا فاصلہ یا کسی اور ذاتی وجہ سے کلاس میں آنا بند کر دیتے ہیں، لیکن بڑی تعداد اُن طلبہ کی ہے جو پوری کوشش کے باوجود کورس میں دلچسپی برقرار نہیں رکھ پاتے۔ اس میں قصور ہمارا ہے طالب علم کا نہیں۔ جو شخص دن بھر کالج میں پڑھ کر آیا ہے یا دن بھر دفتر میں فائیلوں میں سر کھپا کر آیا ہے، اگر اسے بہت خشک انداز میں زبان پڑھائی جائے گی، تو وہ بہت جلد اکتا جائے گا۔ اس سلسلے میں کچھ اور عرض کرنے سے پہلے ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آزادی کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اردو والے مایوس اور احساسِ محرومی کا اس طرح شکار ہوئے کہ تعمیری کام تو کیا کرتے خود اردو کے حال اور مستقبل دونوں سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ پچھلے آٹھ دس برسوں سے مایوسی سے نجات پاکر تعمیری کاموں میں مصروف ہوئے ہیں۔ مختلف صوبوں میں اردو ذریعۂ تعلیم اور اردو بحیثیت مضمون کی نصابی کتابیں تیار کی جا رہی ہیں۔ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی نے ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو پرائمری سے لے کر بارھویں کلاس تک اردو زبان کی کتابیں تیار کر رہی ہے۔ ترقی اردو بورڈ بہت بڑی تعداد میں اعلا تعلیم کے نصاب کے لیے مختلف مضامین کی کتابیں تیار کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے لیکن ہم نے ابھی تک اُن طالب علموں کی طرف توجہ نہیں کی جو بالغ ہیں اور اردو پڑھنے کے متمنی ہیں۔ ان طالب علموں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو بالکل غیر تعلیم یافتہ ہیں اور تعلیم بالغان کی اسکیم کے تحت آتے ہیں اور دوسرے وہ طالب علم ہیں جو پڑھے لکھے ہیں اور جو پہلے ہی سے ایک دو یا اس سے زیادہ زبانیں جانتے ہیں۔ ہم اس وقت دوسرے قسم کے طالب علموں کے تعلیمی نصاب کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

جو تعلیم یافتہ طالب علم اردو پڑھنا چاہتے ہیں، ذہنی استعداد، قوت اخذ، زبان اور تہذیب کے پس منظر کے لحاظ سے انھیں مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بڑی تقسیم تو غیر ملکی اور ملکی ہے۔ غیر ملکی طالب علموں میں وہ طالب علم بھی ہیں، جن کی مادری زبان فارسی اور عربی ہے

اور اپنی مادری زبان کے توسط سے اردو رسم الخط سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ اردو رسم الخط کی بنیاد فارسی رسم الخط پر ہے اور فارسی والوں نے اپنا رسم الخط عربی سے لیا تھا۔ عربی اور فارسی والوں کے لیے ایک دوسرے کا رسم الخط پڑھنا مشکل نہیں ہے، دونوں میں صرف چند آوازوں کا فرق ہے، لیکن عربی اور فارسی والے اردو رسم الخط محنت اور استاد کی مدد کے بغیر نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اردو رسم الخط میں خالص ہندوستانی ہاکاری اور معکوسی آوازیں ہیں، جن پر قدرت حاصل کرنے کے لیے خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ نے اردو میں آکر اپنا تلفظ اور معنی بدل لیے ہیں جن طالب علموں کی مادری زبان عربی یا فارسی ہے، اُن کے لیے یہ الفاظ خاصی مشکلات پیش کرتے ہیں۔ غیر ملکیوں میں دوسری طرح کے طالب علم وہ ہیں، جو عربی اور فارسی سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کے مسائل اور بھی مختلف ہیں۔

اب لیجیے۔ ملکی طالب علم ــــ ملکی طالب علموں سے میری مراد اُن ہندوستانی طالب علموں سے ہے جو اردو پڑھنے کے خواہش مند ہیں ان طالب علموں کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہندی صوبوں کے طالب علم

۲۔ غیر ہندی صوبوں کے طالب علم

ان دونوں کے تعلیمی نصاب کے مسائل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اب میں ہندی صوبوں کے اُن تعلیم یافتہ بالغوں کے مسائل پر گفتگو کروں گا، جو اردو پڑھنے کے خواہش مند ہیں اردو اور ہندی میں بولے جانے والی زبان، جملے کی ساخت، صرف و نحو اور لفظیات کی سطح پر قطعی کوئی فرق نہیں ہے۔ نصاب کی پہلی اور دوسری کتاب میں شاید ہی کوئی ایسا لفظ ہو جس کا مطلب استاد کو بتانا پڑے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ابھی اردو میں مختلف ذہنی سطحوں اور مختلف تہذیبی پس منظر والوں کے طالب علموں کے لیے نصابی کتابیں تیار نہیں کی گئیں۔ حیات اللہ انصاری صاحب کی "دس دن میں اردو" یقیناً ایک کامیاب نصابی کتاب ہے اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں طلبہ اس کتاب کے ذریعے اردو سیکھ رہے ہیں لیکن یہ کتاب تعلیم بالغان کے اُس نصاب میں شامل ہونی چاہیے جس میں طالب علم پہلی دفعہ لکھنا پڑھنا سیکھ رہے ہوں۔ چھوٹے بچّوں کو اردو سکھانے کے لیے میں نے اس قاعدے کا استعمال کیا ہے اور بچّوں کے لیے یہ قاعدہ بہت زیادہ کامیاب ثابت

ہوا ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ طالب علموں کو ڈیڑھ دو مہینے تک "لالا بالالا" یا آپا ٹاپالا" جیسے فقرے پڑھنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دہلی اردو اکادمی نے دہلی میں جو اردو مرکز قائم کیے ہیں ان میں کالج کے طالب علموں کے ساتھ حکومت کے اعلا افسران، وکیل، جج وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یقیناً یہ قاعدہ مناسب نہیں ہے۔ "دس دن میں اردو" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ راست طریقے کے ذریعے اردو پڑھائی جاتی ہے۔ یعنی پہلے مرکب الفاظ لکھنا اور پڑھنا سکھائے جاتے ہیں اور کتاب ختم ہونے پر حروفِ تہجی کی مشق کرائی جاتی ہے۔ پہلے ہی دن طالب علم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہ کچھ اردو سیکھ لی۔ اس لیے اس قاعدے کا ایک ایسا اڈیشن تیار کیا جانا چاہیے جو تعلیم یافتہ اردو پڑھنے والوں کے نصاب میں شامل کیا جاسکے۔ زبان سکھانے کی ابتدائی کتابوں میں لفظوں سے زیادہ اہمیت جملوں کی ہوتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علم کو پورے پورے جملے یاد کرائے جائیں۔ کیونکہ تجربے نے بتایا ہے کہ بالغ طالب علم کو نئی زبان سیکھنے کے وقت پورا جملہ سیکھنے کے لیے اتنی ہی محنت کرنی پڑتی ہے، جتنی کہ ایک لفظ سیکھنے پر۔ اس لیے درست طریقے سے زبان سکھانے والی کتابوں میں پہلے صفحے ہی سے چھوٹے چھوٹے جملے سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جن طالب علموں کی ہم بات کر رہے ہیں، یعنی اردو سیکھنے کے ہندی خواں طالب، اُن کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ طالب علم اردو فقروں کی بنیادی ساخت اور صرفی اور نحوی خصوصیات سے بخوبی واقف ہیں جس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔

ہندی سیکھے ہوئے طالب علموں کو اردو سیکھنے میں سب سے زیادہ پریشانی دو طرح کی ہوتی ہے۔

۱۔ بولنے میں تلفظ کی پریشانی۔ ہندی والوں نے بندی کا استعمال بند کر کے نئی نسل کا تلفظ خراب کر دیا ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہندی والے انگریزی کے ایسے الفاظ کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے، جن میں ف، ج اور س کی آوازیں آتی ہیں۔ ہندی کے ذمہ داروں نے اردو کی ضد میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں کا تلفظ بگاڑ دیا ہے۔ ہندی میں اردو کی کئی آوازیں نہیں ہیں۔ مثلاً خ۔ ز۔ غ۔ ف۔ ق۔ اردو نے جب فارسی، عربی اور بہت سی مختلف زبانوں کے الفاظ مستعار لیے تو کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ جس عہد میں اردو زبان اپنی تشکیل کی ابتدائی منزلوں

سے گزر رہی تھی۔ تو اس عہد کا تعلیم یافتہ طبقہ چونکہ فارسی سے واقف تھا، اور اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ فارسی رسم الخط کو اپنا یا جائے اس لیے ان آوازوں کو تحریری روپ دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور ان آوازوں کی ادائگی پر انھیں پہلے ہی سے قدرت تھی۔

ناگری رسم الخط میں ان آوازوں کے تحریری روپ کے لیے نشانات نہیں تھے۔ اس کا ایک اچھا طریقہ یہ نکالا گیا کہ پہلے ہی سے موجود حروفِ تہجی کے نیچے بندی لگا کر نئی آوازوں کے نشانات بنا لیے گئے۔ مثلاً کَ، کھ، پھ، جَ، گَ، کے نیچے بندی لگا کر ان نئی آوازوں کے لیے تحریری نشان بنا لیے گئے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے یہ طریقہ ترک کر دیا گیا۔ اب نتیجہ یہ ہے کہ ہندی طالب علم ان آوازوں کے صحیح تلفظ پر قدرت نہیں رکھتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ان میں سے بعض آوازوں کی ادائگی تو کر سکتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کس لفظ میں کونسی آواز ہے۔ مثلاً وہ پھل کو فل، پھر کو فر، کہے گا اور اس کے برعکس فروٹ کو پھروٹ اور فاصلہ کو پھاسلہ کہے گا۔ اسی طرح وہ ظالم کو جالم اور جلیل کو ذلیل کہے گا۔ آل انڈیا ریڈیو ہمیشہ عبد الغنی خاں چودھری کو عبدل گھنی کھان چودھری۔ اور خورشید عالم خاں کو کھرشید عالم کھان کہتا ہے۔

ان طالب علموں کے لیے جو کتابیں تیار کی جائیں اُن میں پہلی کتاب میں ایسے الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا جائے، جن میں اردو کی مخصوص آوازیں خ۔ ز۔ ژ۔ غ۔ ف اور ق کا استعمال شامل ہو۔ اس سلسلے میں اہلِ زبان کی آوازمیں کیسٹ تیار کرائے جانے چاہئیں۔ کلاس میں پہلے استاد ان آوازوں پر لیکچر دے۔ پھر کیسٹ سنایا جائے اور آخر میں طالب علموں سے وہ الفاظ دہروائے جائیں۔

اردو سیکھنے والے کے راستے میں دوسری بڑی مشکل اردو املا کی پیچیدگیاں ہیں۔ ایک ہی آواز کے لیے مختلف علامتیں ہیں مثلاً 'ز' آواز کے لیے ز، ذ، ض، اور ظ۔ 'س' آواز کے لیے ث، س، ص اور 'ت' آواز کے لیے ت اور ط، طالب علموں کی بڑی تعداد املا کی ان پیچیدگیوں سے گھبرا کر اردو پڑھنا چھوڑ دیتی ہے۔ دنیا کا کوئی رسم الخط ایسا نہیں ہے جس میں مخصوص پیچیدگیاں نہ ہوں۔ اگر بچے کو اس کی مادری زبان کی املا سکھائی جا رہی ہے تو اتنے عرصے تک مشق کرائی جاتی ہے کہ صحیح املا بچے کے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ بڑوں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ان کے پاس بہت زیادہ

وقت نہیں ہوتا اور چونکہ وہ پہلے ہی سے ایک یا ایک سے زیادہ رسم الخطوں سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے اور رسم الخطوں سے واقفیت بھی اُن کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ ان حالات کے بپیش نظر تحریری مشق کرانے کے لیے کم سے کم دو کتابوں کا تیار کرنا ضروری ہے، تاکہ ان کتابوں کے ذریعے استاد طالب علموں کو مشق کرا سکے۔

نصاب کی پہلی کتاب میں چھوٹے چھوٹے جملے ہوں، لیکن ان جملوں میں جو باتیں کہی جائیں اُن کا معیار بلند ہو۔ اردو کی مخصوص آوازوں پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ نصاب کی دوسری کتاب میں اردو محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔

غیر اردو داں طالب علموں کو اردو کے تہذیبی الفاظ کے استعمال کا بہت شوق ہوتا ہے مثلاً تشریف لائیے، پھر حاضر ہوں گا۔ آپ کو زحمت تو ہوگی۔ کیا آپ میرے حال پر کرم فرمائیں گے۔ نوازش ہے۔ میں کس قابل ہوں۔ اس طرح کے الفاظ اور ترکیبوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو طالب علم سیکھنا چاہتے ہیں۔ ماشاء اللہ، انشاء اللہ اور خدانخواستہ جیسے الفاظ بھی اسی فہرست میں آتے ہیں۔ آپ کو ایسے لوگوں سے یقیناً واسطہ پڑا ہوگا جو کہتے ہیں کہ "جب آپ خدانخواستہ تندرست ہو جائیںگے" وہ کہنا چاہتے ہیں "جب آپ انشاء اللہ تندرست ہو جائیں گے"۔ اس طرح کے تمام تہذیبی الفاظ کا نصاب کی دوسری کتاب میں زیادہ سے زیادہ استعمال ہونا چاہیے۔ بلکہ ایک یا دو سبق ایسے ہونے چاہئیں جن میں ان الفاظ کا خصوصیت سے استعمال کیا گیا ہو۔

نصاب کی تیسری کتاب میں ایسے سبق ہونے چاہئیں، جن سے طالب علم، کاروبار کی زبان، اخبار اور ریڈیو کی زبان سمجھنے اور لکھنے پر قدرت حاصل کر سکے۔ اس کتاب میں اردو کلاسیکی نظم اور نثر کا انتخاب بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ یہ بھی کوشش کی جانی چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ ایسے اردو الفاظ کا استعمال کیا جائے جو عام بول چال میں نہیں آتے۔

ہندی داں طالب علموں کو اردو شاعری کا بہت شوق ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ پوری پوری غزلوں کے بدلے اگر منتخب اشعار اس نصاب میں شامل کیے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ان اشعار کے انتخاب میں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ فکر اور اظہار کی سطحوں پر پیچیدگی نہ ہو۔ سیدھی سادی زبان میں عام فہم باتیں کہی گئی ہوں۔ اگر ایک دفعہ اردو شاعری میں طالب علم کو

دلچسپی پیدا ہوگئی تو پھر وہ اچھی شاعری کا مطالعہ خود کرے گا۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ انجمن ترقی اردو (ہند)، ترقی اردو بورڈ، اردو اکادمی اور این سی ای آر ٹی مل کر اس موضوع پر ایک چھوٹا سا سیمینار کریں اور پھر ایک ایسی کمیٹی تشکیل دیں جو اس طرح کی کتابیں تیار کرے۔ انجمن ترقی اردو یہ کتابیں شائع کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر سکتی ہے۔

عبدالستار دلوی

غیر اردو علاقوں میں اردو نصاب کے مسائل

ہماری زبان کے بیشتر الفاظ کی طرح " نصاب" کی اصطلاح کو بھی مختلف انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ معلمین بھی اس اصطلاح کو اس قدر مختلف انداز سے استعمال کرتے ہیں کہ اس کا مفہوم ہی خلط ملط ہو جاتا ہے حالانکہ ماہرینِ نصاب نے اس کی توضیح کی خاطر لفظ " نصاب" کے معنی کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس مسئلے پر اختلاف رائے آج بھی موجود ہے کہ اس لفظ کی صحیح تعریف کیا ہے۔

وسیع تر مفہوم میں اس شعبے کے ماہرین، نصاب کی اصطلاح کو عام طور پر دو طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ متعلّم کے تعلیمی منصوبے کا ایک سرسری تعین اور دوسرے مطالعے کے شعبے کی حد بندی، لیکن موجودہ حالات میں اصطلاح " نصاب" کے یہ دونوں پہلو ایک دوسرے میں مدغم ہو کر رہ گئے ہیں۔ بیشتر خصوصی شعبوں کی طرح مطالعے کے ایک شعبے کی طرح نصاب کی تعریف دو طرح سے کی جا سکتی ہے، اوّل یہ کہ اس کے متعلقہ موضوعات کی وسعت یعنی اس کی حقیقی ساخت کا تعین اور دوسرے یہ کہ اس کے بعد شروع ہونے والی تحقیق اور عملی کاموں کے طریقہ ہائے کار یعنی اس کی تجزیاتی ساخت کا تعین۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تعلیم کے تعلق سے مختلف موضوعاتِ کار کا ایک مجموعہ ہے اور اس میں بہت سے طریقہ ہائے کار بھی شامل ہیں جن کا تعلق براہِ راست ماہرینِ تعلیم سے ہے۔

نصاب، موضوعات کے اعتبار سے حد بندی اور منصوبہ بندی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا

تعلق تدریس اور طریقۂ تدریس سے بھی ہے۔

دیگر علوم کے برعکس مادری زبان کا مطالعہ تعلیم کی بنیاد کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے بچّہ اپنے اطراف کے سماجی وقدرتی ماحول کے بارے میں اپنی معلومات کو وسعت اور فروغ دے سکتا ہے اور یہ بچّے کی تعلیمی زندگی کی بنیاد ہے کیونکہ ثانوی اسکول، کالجوں، یونیورسٹیوں اور عملی زندگی میں اس کی مزید تعلیم اسی زبان کے واسطے سے زیادہ سود مند اور ذہنی نشوونما کے لیے زیادہ بہتر سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا ابتدائی یا ثانوی مرحلے میں کسی بھی تعلیم کے لیے مادری زبان پر عبور ہونے کو پہلی اور لازمی شرط سمجھا جانا چاہیے۔

مادری زبان کی تدریس کا مقصد دوسرے لوگوں کی جانب سے پیش کیے ہوئے خیالات و جذبات اور احساسات کی تفہیم میں بچّے کی رہنمائی کرنا اور اس طرح اس کے سامنے عقل، حسن اور تحریک کی دنیا کے اسرارِ مخفی کو کھول کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ مادری زبان بچّے کو خود اپنے اظہار خیال اور رابطے کے لیے ایک متناسب اور موثر واسطہ فراہم کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ اس طرح یہ بچّے کی شخصیت کو نکھارنے کے لیے ایک زبردست اور مکمل واسطہ اور ایک زبردست متحدہ طاقت ہوتی ہے جو اپنے وسیع تر تناظر میں اپنے بولنے والوں کی انفرادی شناخت، علاقائی یکجہتی اور سماجی اتحاد میں اپنا تعاون دیتی ہے۔

مادری زبان کا مطالعہ کثیر لسانی تناظر میں بالواسطہ طور پر قومی اور جذباتی ہم آہنگی کے مقصد کو بھی پورا کرے گا۔ یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے کہ نصابی کتابوں کے اسباق زبانی اور تحریری انشا پردازی اور اضافی مطالعے کے لیے ایسا مواد فراہم کریں جو زبان وادب کے مطالعے میں براہِ راست، قومی وجذباتی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں بالواسطہ طور پر معاون ثابت ہو مادری زبان کو اپنی انفرادی آزادانہ شناخت کو قائم رکھتے ہوئے دوسری زبانوں، ملکوں یا علاقوں مذاہب اور ثقافتوں کے لیے ایک روادارانہ نقطۂ نظر پیدا کرنے میں بچّے کی مدد کرنی چاہیے۔

بنیادی مرحلے میں مادری زبان کی تدریس کے وسیع مقاصد بچّے میں مندرجہ ذیل صلاحیتیں اور اہلیت پیدا کرنا ہونا چاہیے:

۱۔ کسی بات کو سن کر سمجھنے کی صلاحیت

۲۔ اپنے خیالات وجذبات واحساسات کو زبانی طور پر بھرپور، واضح اور صاف انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت۔

۳۔ پوری تفہیم کے ساتھ خاموشی سے پڑھنے کی صلاحیت۔

۴۔ اپنے خیالات کو تحریری طور پر صحیح زبان میں منطقی دلائل کے ساتھ موثر انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت۔

۵۔ صحیح تلفظ اور طرزِ اظہار کے ساتھ صاف اور واضح طور پر بلند آواز میں پڑھنے کی صلاحیت۔

۶۔ خوشخط اور صاف لکھنے کی صلاحیت۔

۷۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ:۔

(الف) ایک وسیع تر ذخیرۂ الفاظ کو صحیح اور ترقی یافتہ انداز میں سمجھنے اور استعمال کرنے میں بچے کی مدد کی جائے۔

(ب) مادری زبان کی ترکیبی ہیئت کا ایک ضروری اور وسیع علم حاصل کرنے میں بچے کی مدد کی جائے، تاکہ اس کو مادری زبان کے مزید مطالعے نیز دوسرے موضوعات کے مطالعے کے لیے بھی ایک مناسب بنیاد فراہم کی جا سکے اور اس میں اچھی کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کیا جائے۔

زبان بنیادی طور پر ایک عادت ہوتی ہے اور مادری زبان کے مطالعے میں یہ وصف ہونا چاہیے کہ وہ بچے میں بولنے، لکھنے اور پڑھنے کی اچھی عادتیں پیدا کرے اور یہ عادتیں اس قدر راسخ ہوں کہ وہ اسکول کے باہر سنی ہوئی غلط گفتگو کے اثرات زائل کر سکیں ـــــ غیر اردو علاقوں میں اردو نصاب اور تدریس میں اس بات پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

مادری زبان کی تعلیم و تدریس میں مذکورہ مقاصد کی اہمیت اور ضرورت کے باوجود کثیر لسانی ماحول میں ملک گیر زبانوں کی تدریس اور نصاب کے اصول اور اس کی ضرورتیں مختلف ہوجاتی ہیں۔ کثیر لسانی ماحول میں زبانوں کا معیار Standard ایک تخمینی لیبل Approximate Label ہے، علاقائی محاورہ کثیر لسانی ممالک میں زبانوں کی تقدیر بن جاتا ہے۔ تاہم ایک تخمینی معیار Approximate Standard کی تلاش کی ہمیشہ ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی۔

۱۹۴۷ء میں آزادیٔ وطن کے بعد ہمارے نصاب میں مادری زبان کو اس کا جائز مقام دیا جانے لگا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہے کہ معلم اور متعلم دونوں کو جدید سائنسی طریقوں سے آشنا کیا جائے جس کے ذریعے درس و تدریس اور زیادہ موثر انداز میں ہو سکے۔ انسان اپنے ذاتی اور انتہائی نازک خیالات کو اپنی مادری زبان ہی میں سوچتا ہے اور اسی لیے مادری زبان کا یہ حق ہو جاتا ہے کہ اس پر توجہ دی جائے اور اسے پروان چڑھایا جائے۔

اردو ہندوستان کی ملک گیر زبان ہونے کی وجہ سے بہت ہی اہم زبان ہے۔ آزادی سے پہلے اس کو حکومت میں اور ملک کی ادبی، ثقافتی اور تعلیمی زندگی کے مختلف گوشوں میں ایک اعلا مقام حاصل تھا اور آج بھی اس کو مختلف علاقائی اسالیب کی شکل میں ایک بین الریاستی یا قومی زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو کا تعلق اتر پردیش اور اس کے ملحقہ علاقوں سے ہے۔ ہندی کا علاقہ اردو کا علاقہ بھی ہے۔ لہٰذا اردو کو خود اپنی ریاستوں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کو ہندی کی ریاستوں میں اردو کو درپیش مسائل میں شمار کرنا غلط ہوگا۔ لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی کا تعلق ایک اور صرف ایک علاقے سے ہے اور اردو کو خود اس کے علاقے میں اجنبی نہیں بنایا جا سکتا۔ اس زبان نے رابطے کی زبان کی حیثیت سے اپنے علاقے سے باہر بھی پرورش پائی اور ہر علاقے میں اس نے وہاں کے مقامی اثرات بھی قبول کر لیے ہیں۔ بہت سے غیر اردو علاقوں میں اس نے ایک ثقافتی، مذہبی اور مادری زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں سارے ملک میں اردو کے نصاب اور درس و تدریس کے مسائل یکساں نہیں ہیں۔ یہ زبان ذولسانی تناظر اور ایک نسبتاً اجنبی ثقافتی ماحول میں بولی جاتی ہے۔ غیر ہندی، اردو علاقوں میں بولی جانے والی زبان ایک بولی کی شکل اختیار کر گئی ہے، لہٰذا وہاں اس کے بولنے والے اس کے معیاری اسلوب پر قدرت نہیں رکھتے، لہٰذا ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اردو کے معیاری اور ادبی اسلوب کو سیکھیں اور اس کی ادبی نزاکتوں سے آشنا ہو سکیں۔

بمبئی ہمیشہ سے ایک کثیر لسانی شہر رہا ہے۔ یہاں کے اردو بولنے والے عوام سوائے ان لوگوں کے جو یوپی کے اضلاع یا یوپی کے شہروں سے یہاں آئے ہیں ذولسانی جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک بولی کا اسلوب رکھنے والی اردو کے علاوہ کوکنی، گجراتی اور کچھی زبانیں بولتے ہیں۔ ان زبانوں

کی صوتیات اور قواعد نے اردو کے اس مقامی اسلوب پر اثرات ڈالے ہیں جسے یہ لسانی برادری Linguistic Community ذریعۂ اظہار بنائے ہوئے ہے۔ لہٰذا اپنے علاقے کی حدود سے باہر اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کے مسئلے کو اس پہلو سے دیکھا جانا چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو جن کی مادری زبان ایک علاقائی شکل رکھنے والی اردو Dialected Urdu ہے شمالی ہند کے محاورے سے تقریباً مماثلت رکھنے والی اردو پڑھانے کا مسئلہ ہے۔ کثیر لسانی بمبئی، مہاراشٹر کے اضلاع، کرناٹک اور آندھرا اور گجرات میں اردو کو ایک مادری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں اردو کی حیثیت مادری زبان اور ثانوی زبان آپس میں شیر و شکر ہوگئی ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے علاقوں میں اردو پڑھنے اور سیکھنے کے شوق اور لگن کا جائزہ لیا جائے اور اسی اعتبار سے تدریس کے طریقے اور مواد کی تشکیل کی جائے اور ابتدائی نصاب مرتب کیا جائے۔

زبان بنیادی طور پر اظہارِ نطق کی ایک شکل ہے لہٰذا بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر اردو علاقوں میں اردو بولنے والی لسانی برادری Linguistic Community کی صوتی عادتوں میں اردو کے صوتی نظام کے تعلق سے اصلاح کی جائے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ اردو بولنے والے کثیر لسانی طبقات کو Multilingual صوتی خصوصیات تجزیاتی جائزوں اور مشاہدات کے ذریعے اردو زبان کی معیاری شکل سے قریب تر لایا جائے۔ معیاری اردو کی تدریس اور درسی کتب کی تیاری میں اردو اور علاقائی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ بمبئی اور دیگر علاقوں میں اردو بولنے والے طبقے کی صوتی اور صرفی عادات مقامی بولیوں سے بہت زیادہ متاثر ہیں، اس لسانی ضرورت کے پیشِ نظر اردو زبان کے اساتذہ کو جو لسانی علوم سے واقف نہیں ہوتے، عام صوتیات، اردو صوتیات اور اردو نیز مقامی بولیوں کے تناظر میں تقابلی صوتیات کی بنیادی تربیت دی جانی چاہیے۔ زبان اور بولی کا فرق نوعیت کا نہیں بلکہ مقدار کا ہوتا ہے اس لیے زبان کی مختلف بولی جانے والی شکلوں کا تقابلی مطالعہ کر کے اس کے "بولی پن" Diatectation کو کم کرنے کی کوششیں جو کل ہند زبانوں کے مرکزی ادارے (میسور) جیسے اداروں کی جانب سے کی جارہی ہیں، اس نصابی اور تدریسی مسئلے کو بڑی حد تک حل کر سکتی ہیں۔

زبان کی منصوبہ بندی Language Planing میں اس کا لکھنا اس کے بولنے کے مقابلے

میں اہم یا کچھ زیادہ اہم ہے۔ کوئی بھی علم لسانیات کی رو سے اس خیال کی زبردست اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا کہ تاریخی اعتبار سے کسی زبان کو لکھنا اس کے بولنے کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور اس اصول کا اطلاق کسی فرد کے تدریسی عمل اور اس کی زندگی کے بارے میں بھی ہوتا ہے لیکن زبان کی منصوبہ بندی کے مطالعے میں ہمیں اس تعلق کو الٹ دینا پڑے گا، ہمیں لکھنے کو مقدم اور بولنے کو ثانوی حیثیت دینا ہوگی۔ معکوسیت کے اس عمل کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے کا عمل کسی زبان کے بولنے والوں کے درمیان، جن میں وقت اور مقام کا فاصلہ حائل ہو، رابطے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے لیکن زبان کی وہی شکل کارآمد ہوتی ہے جس کا سیکھنا اور استعمال کرنا آسان ہو۔ اور اسی لیے لکھنے کو آسان اور موثر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اردو زبان کی، جو ایک مخلوط ثقافت کی نمائندگی بھی کرتی ہے، ثقافتی روایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے طرزِ تحریر اور املا میں اصلاحات کی جائیں۔ ترقی اردو بورڈ کی سفارشات کا جو اس نے اپنی کتاب "املا نامہ" میں پیش کی ہیں، نظرثانی کے بعد خیر مقدم کیا جانا چاہیے اور انھیں نصابی کتابوں میں استعمال ہونا چاہیے۔ اس سے اردو املا اور ہجے کے اصول و ضوابط کو سیکھنا اور استعمال کرنا اردو بولنے والوں کے لیے آسان ہو جائے گا چاہے وہ اردو کے لسانی علاقے کی حدود میں رہتے ہوں یا اس سے باہر۔

بچے اپنی زبان اپنے والدین اور اپنے دوستوں سے سیکھتے ہیں۔ اگر والدین تعلیم یافتہ نہیں ہیں تو وہ لازمی طور پر اپنے بچوں کو زبان کا صحیح استعمال نہیں سکھا سکتے۔ لہٰذا ایک اسکولی نصاب کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ بچے کو زبانی اور مطالعاتی مشقوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرے تاکہ اُس کے گھر اور ماحول کے اثرات کو دور کیا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک اچھے تدریسی و مطالعاتی مواد کی خصوصاً غیر اردو علاقوں میں سخت ضرورت ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ بچوں کو رسمی قواعد سکھائی جائے کیونکہ ایک زبان کے سیکھنے والے کے لیے یہ ایک تکلیف دہ عمل ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کے مقابلے میں کچھ زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید کام کیا جائے۔ انھیں دوسروں کی نقل کرنے اور بطور خود بھی مشق کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور انھیں سلسلہ وار مطالعے کے لیے ایسا مواد بھی فراہم کیا جائے جو ان کی عمر اور ان کے ماحول سے مطابقت رکھتا ہو۔ نصابی کتابوں میں "سرسری مطالعے" کے تحت منتخب شعری اور نثری ادب کے ذریعے بھی اس مقصد کو حاصل کرنے میں

پیش قدمی کی جاسکتی ہے۔

بمبئی اور اسی طرح دیگر غیر اردو علاقوں میں بھی جہاں اردو ایک بولی کی شکل میں مادری زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ہے نصاب اور تدریس زبان کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہاں اردو زبان کے معیار، روزمرہ اور محاورے کا فقدان ہوتا ہے۔ اسکول اور کالج کی سطح پر پڑھائی جانے والی زبان ادبی اور کتابی زبان ہوتی ہے، ایک بچے کا ذخیرۂ الفاظ، ادائیگی اور محاورہ یا توکسی بولی پر مبنی یعنی مقامی نوعیت کا ہوتا ہے یا پھر کتابی۔ اس لیے ضروری ہے کہ شمالی ہند کی اردو کا طرزِ ادا اور محاورہ ان بچوں کو مطالعہ جاتی مواد کے ذریعے فراہم کیا جائے جو خصوصی طور پر ایسے مذکورہ بالا ماحول کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لیے ابتدائی ادا..گی اور محاورے پر مبنی چھوٹے چھوٹے کتابچے زبردست اہمیت کے حامل ہوں گے۔ لہٰذا خصوصی طور پر تیار کی ہوئی سلسلہ وار کتابیں اس قسم کی ادائیگی اور طرزِ اظہار کی حامل ہوں تاکہ بچہ معیاری روزمرہ سے واقف ہو سکے۔ زندگی کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے روزانہ استعمال کے الفاظ کا ذخیرہ معلّم اور متعلّم دونوں کے لیے انتہائی کارآمد ہوگا جس کو ہر وقت حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بچے سبزیوں، ترکاریوں، پھلوں، پھولوں، پودوں، چڑیوں اور جانوروں کے مقامی ناموں سے واقف ہوتے ہیں لیکن انھی کے لیے معیاری زبان میں استعمال کیے جانے والے ذخیرۂ الفاظ سے واقف نہیں ہوتے جن کا ایک بچے کے لیے اپنی مادری زبان کے ایک جزو کی حیثیت سے جاننا ضروری ہے۔ معیاری روزمرہ کی ادائیگی طرزِ اظہار اور محاورے میں معانی کی کئی پرتیں بھی ہوتی ہیں جن سے ادب کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ اِن چیزوں کی کمی سے ادب کی تفہیم بعض مرتبہ ان لوگوں کے لیے دشوار ہو جاتی ہے جو غیر اردو علاقوں یا بمبئی جیسے ذولسانی یا کثیر لسانی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

مہاراشٹر میں حکومت کے قائم کردہ ٹیکسٹ بک بیورو کے زیرِ اہتمام اردو کی نصابی کتابیں گذشتہ تقریباً پندرہ سال سے رائج ہیں اور ہر تیسرے سال نظرِ ثانی کے بعد نئے طور پر شائع ہوتی ہیں۔ بلامبالغہ ہندوستان میں مروجہ نصابی کتابوں میں انھیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں جدید نصاب کے نئے طریقے اپنائے گئے ہیں اور نئے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے اسباق شامل کیے گئے ہیں جو قومی، علاقائی اور اردو پڑھنے والوں کی ضروریات (جو سبھی مسلمان ہیں) کا پورا پورا

لحاظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان نصابی کتابوں میں ان اسباق کے علاوہ جنھیں کلاس روم میں پڑھایا جانا ضروری ہے، سرسری مطالعے کے لیے مختلف اصنافِ ادب مثلاً افسانے، ڈرامے، انشائیے وغیرہ بھی شامل ہیں تاکہ بچے اپنے میں ادب کی مختلف اصناف سے متعارف ہوں اور ان میں مطالعے کی عادت پڑے، تاہم ضروری ہے کہ غیر اردو علاقے کا نصابی سلسلہ ہونے کی حیثیت سے Language across the Culture کی ضروریات کے پیشِ نظر مقامی محاوروں اور روزمرہ اور "اردو والوں" کا روزمرہ اور محاورے پر مشتمل الفاظ کی فہرستیں بھی دی جائیں تاکہ بچوں میں "بولی پن" کی خصوصیات کم سے کم رہیں اور وہ ادبی فن پاروں کی جمالیات سے لطف اندوز ہوسکیں جو بیشتر شمالی اردو سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس خالص لسانی مسئلے کے حل کے لیے یہ عین ممکنات میں سے ہے کہ درسی کتابوں کے آخر میں ہر کتاب کا نیا ذخیرۂ الفاظ مقامی لفظیات کے ساتھ شامل کیا جائے۔ ہمارے ہاں تصویری لغت Pictorical Dictionaries ابھی مروج نہیں ہیں لہٰذا غالب کی مرزئی کا تصور پیدا کرنے کے لیے جس سے دلّی کا ہر طالب علم واقف ہے، غیر اردو علاقوں کے اردو کے طالب علم کو اس سے واقف کرانے کے لیے اس قسم کا لغت ضروری ہے۔ اگر اس طرح کی نصابی کتب ترتیب دی گئیں اور اہلِ اردو کے محاورے کے پیشِ نظر مختلف علاقائی بولیوں اور معیاری اردو کے ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل مواد فراہم کیا گیا تو بچوں میں اظہار کی قوت اور قوتِ اظہار سے زیادہ اظہار میں خود اعتمادی پیدا ہوگی، جس کی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود وہ اپنے میں کمی محسوس کرتے ہیں۔

اس بحث سے مندرجۂ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:-

۱۔ غیر اردو علاقوں میں اردو نصاب اور تدریس علاقائی تہذیبی، تاریخی اور لسانی تناظر میں ہو۔

۲۔ صوتی اور صرفی سطح پر زیادہ سے زیادہ مشقیں کرائی جائیں اور علاقائی زبانوں کی خصوصیات سے اردو کی صوتیات کا مقابلہ کرتے ہوئے، آوازوں کی مشق کرائی جائے، جس سے ہمارا موجودہ نصاب عاری ہے۔

۳۔ ذخیرۂ الفاظ اور مقامی محاوروں کی فہرستیں تیار کی جائیں اور ان کے لیے متبادل معیاری

اردو کے الفاظ بتائے جائیں جو غیر اردو کے علاقوں میں اردو نصاب اور تدریس کی بہت بڑی کمزوری ہے۔

۴۔ علاقائی تاریخ اور ثقافتی اقدار کے ساتھ ہندوستانی تاریخ کی کل ہند اہمیت کے حامل عناصر کی بھی نصاب میں پوری پوری نمائندگی ہو۔

۵۔ فارسی اور عربی کے لسانی اور تہذیبی و تاریخی اثرات کی بھی نصاب میں بھرپور نمائندگی ہو تاکہ وہ اپنی اس انفرادیت سے پہچانی جاسکے۔

اگر ایسا کیا گیا تو غیر اردو علاقوں میں مادری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے بچوں کی صلاحیتوں کو نکھارا جاسکتا ہے اور مادری زبان کے مذکورہ مقاصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

شمیم نکہت

غیر اردو داں طلبہ کے لیے اردو تعلیم کے مسائل

کسی بھی زبان کی تعلیم و تدریس کے لیے سخت اور بے لچک اصول درست نہیں ہو سکتے، اس لیے زبان کی تعلیم پر بہت سی چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں، اس میں زبانوں کے خاندان، علاقہ، طلبا اور استاد سب یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

اس مقالے میں صرف شمالی ہندوستان کے رہنے والے طلبا کو پڑھانے کے مسائل اور اصولوں سے بحث کی گئی ہے، یا ایسے طلبا جو ہندی بول اور سمجھ سکتے ہوں۔

اگر ہم اردو زبان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ اردو اور ہندی دونوں سگی بہنیں ہیں۔ ایک ہی گود میں پلی اور ایک ہی ماں یعنی کھڑی بولی سے پیدا ہوئیں۔ ان دونوں زبانوں میں بے حد مشابہت ہونے کے باوجود صوری اعتبار سے نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ ایک ہی علاقے کی پروردہ دونوں زبانوں کے کلچر اور روایت میں بھی کافی فرق ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں دنیا کا ہر ملک زیادہ سے زیادہ غیر ملکی زبانیں سیکھنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ہر ملک میں مشرقی و مغربی زبانوں کے الگ الگ شعبے ہیں جن میں دنیا کی مختلف زبانیں سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور زبان کی تدریس کے سلسلے میں نئے نئے اصول مرتب کیے جاتے ہیں۔ زبانوں کے سکھانے کے لیے جدید ترین لیب وجود میں آچکے ہیں۔ ریڈیو اور T.V. کے ذریعے بھی درسِ زبان کا عام رواج ہو گیا ہے جو کافی حد تک کامیاب بھی ہے۔ ملکوں میں

طلبا کا تبادلہ Exchange بھی زبان کو جلد از جلد سیکھ لینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

غیر ممالک کے طلبا کو دوسری زبان سیکھنے یا سکھانے میں اب زیادہ دشواری نہیں ہوتی ہے تو ایک ہی علاقے اور ایک ہی خاندان کی بولی سیکھنے میں دشواری کیونکر باقی رہ سکتی ہے۔ ایسے طلبا کو عام طور پر زبان بولنے اور سمجھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوتی ہے، لیکن یہاں معاملہ ہر تدریس کا جو بغیر کسی اصول کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ زبان سکھانے کا کوئی بھی بندھا ٹکا اصول ہر علاقے اور ہر زبان کے سکھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں طلبا کی ضرورت کے مطابق استاد کو تھوڑی بہت تبدیلی ضرور کرنی پڑتی ہے۔

عام طور پر ایسے طلبا کی تدریس کے لیے ہمیں اسباق کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔

پہلا — بولنا اور سمجھنا (جس کے لیے زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا) اور

دوسرا — پڑھنا اور لکھنا (جو زبان سیکھنے میں خاصا محنت طلب ہے)

زبان سکھانے کا پہلا اصول وہی ہونا چاہیے، جس طرح بچہ ماں سے زبان سیکھتا ہے۔ یعنی استاد آسان جملے طلبا کے سامنے دہرائے۔ اور طلبا سے یہ جملے صحیح تلفظ کے ساتھ بار بار کہلائے۔ جملے عام فہم اور بول چال کے ہونے چاہئیں۔ جنھیں طلبا کلاس سے باہر بھی استعمال کر سکیں۔ استاد ان جملوں کو خود بھی بار بار دہرائے تاکہ قوتِ سامعہ کی مدد سے طلبا بھی جملے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر سکیں — کلاس میں طلبا سے انفرادی طور پر بھی یہ جملے سننا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کلاس کے کتنے طلبا کن کن آوازوں کو ادا نہیں کر سکتے — استاد کے پاس یہ آوازیں نوٹ ہونی چاہئیں تاکہ مشق کے دوران ان اصوات سے طلبا کو آشنا کرانے میں آسانی ہو۔ استاد کو پہلے خود بھی وہ آوازیں پیدا کر کے غور کر لینا چاہیے کہ آواز کا مخرج کیا ہے۔ چونکہ استاد عام طور سے زبان کے استعمال میں ماہر اور صاحبِ زبان بھی ہوتا ہے، اس لیے اتنی باریکی سے مخرج کے بارے میں نہیں سوچتا ہے — اگر کوئی بیالوجیکل Defect یعنی عضوی خرابی نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تھوڑی کوشش سے دنیا کی کوئی بھی آواز نکالنے میں دشواری باقی رہے اس مشق کے لیے ہمیں ہونٹ، دانت، تالو، زبان، گلے اور گردن کے حصوں کے ذریعے نشاندہی کرانی چاہیے کہ کس آواز کا مخرج کہاں ہے اور منھ کے اندر اعضا کی پوزیشن کیا ہے۔ آوازوں کا

استعمال اس طرح ہونا چاہیے کہ ان کو شروع، درمیان اور آخر میں بولا جائے، جیسے شان، مشکل فرش یا غصہ، مغرور اور داغ وغیرہ اور ان کی اچھی طرح پریکٹس کرانی چاہیے۔ اس طرح معمولی کوشش سے طالب علم مشکل آوازوں کو نکال سکے گا۔ اور پھر اس شوق میں کہ اُسے اردو کے خوبصورت الفاظ بولنے آ گئے ہیں، خود سے بھی بولنے کی کوشش کرے گا۔ یہاں تک کہ سنترے کو شنترہ اور جانب کو زانب کہتے ہوئے بھی نہیں چوکے گا۔ اس لیے استاد کو یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ جب تک پڑھنا نہ آجائے صرف سیکھے ہوئے جملے ہی ایسے بولنے چاہئیں۔ اس سلسلے میں طالب علم کے پسندیدہ اشعار کی قرات بھی معاون ہوتی ہے جو انھیں پہلے سے یاد ہوتے ہیں۔ اشعار وہی لینا چاہیے جو معیاری ہوں اور ان کا مطلب بھی پوری طرح سمجھانا چاہیے۔ چاہے وہ اشعار فلمی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سلسلے میں طلبا سے ایک ڈائری رکھنے کو بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ اپنی پسند کے خوبصورت جملے اور پسندیدہ اشعار لکھیں۔ یہ اشعار وہ ہندی رسم الخط میں لکھ سکتا ہے جس کی تصحیح استاد کو کرنی چاہیے۔ اور اگر ضرورت ہو تو نقطوں کے استعمال سے 'ک' کو 'ق' اور 'ج' کو 'ز' میں تبدیل کرا دینا چاہیے۔

ہندی بولنے والے طلبا کو بولنا اور سمجھنا سکھانے میں بہت وقت نہیں لگتا اس لیے استاد کو کچھ جملے اور فقرے کسی اچھے ابتدائی قاعدے سے لینا چاہیے تاکہ آگے چل کر پڑھنے اور لکھنے کی اسٹیج پر طلبا مانوس اور سیکھے ہوئے جملے پڑھیں۔ آج کل بہت سے قدیم و جدید قاعدے رائج ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ان سب میں حیات اللہ انصاری صاحب کا قاعدہ "دس دن میں اردو" سب سے بہتر ہے۔

لیکن کسی بھی مطبوعہ قاعدے پر مکمل طور پر انحصار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جملے اور آوازوں کے Combination خود بھی بنانے پڑیں گے جس کے لیے استاد کو اچھی خاصی محنت اور یکسوئی کی ضرورت ہے۔ جملے اس طرح بنانے چاہئیں کہ آسان ہونے کے ساتھ ساتھ ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہوتا جائے اور روزمرہ بات چیت کے چھوٹے چھوٹے بنیادی اردو کے جملے یاد ہوتے چلے جائیں۔ اس طرح طلبا میں اعتماد آجائے گا اور ان کی کوشش ہوگی کہ وہ جلد سے جلد پڑھنا اور لکھنا بھی سیکھ جائیں۔ اور اب ان کو پڑھنا اور لکھنا بہت آسان ہو جائے گا۔

چونکہ طالب علم جملوں کی ساخت سے پوری طرح واقف ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے اس کو مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ لیکن اس اسٹیج پر بھی تلفظ کی دشواری کئی طلبا کے لیے باقی رہتی ہے۔ اس دشواری کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ تلفظ کا حسن ہی بہت بڑی دلکشی ہوتی ہے جس کے سبب طلبا اردو کی طرف راغب ہوتے ہیں عام طور سے طلبا اردو اس لیے نہیں پڑھتے ہیں کہ ان کو کوئی اہم سارٹیفکٹ یا ڈگری ملے گی بلکہ زبان کے حسن اس کی شیریں بینی، نرم و نازک لہجے دلکش تلفظ اور ان تمام خوبیوں سے سجی غزلیں ان کے شوق کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے استاد کو کسی آواز یا اظہار Expression کو بار بار بتانے میں کمی نہیں کرنی چاہیے۔ کسی ایک طالب علم کی تصحیح کلاس کے دوسرے طلبا کے لیے مفید ہوتی ہے۔

تدریس کے دوسرے مرحلے میں باقاعدہ پڑھنا اور لکھنا آتا ہے۔ جو بولنے اور سمجھنے کے ساتھ ہی جڑا ہوا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض جملے طلبا پہلے ہی زبانی سیکھ چکے ہوتے ہیں جن کے سبب اب پڑھنے اور لکھنے میں تلفظ اور آوازوں کو حرف کے نام کے ساتھ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ طلبا اپنے جانے پہچانے جملوں اور آوازوں کے سبب حرف کے ناموں کی شناخت جلدی کر لیتے ہیں۔

پڑھنا اور لکھنا سکھانے کے لیے یہاں پر چند مثالیں دینا ضروری ہیں۔ جیسے حروف تہجی کی تقسیم کر کے ان کی آواز کے ساتھ لکھنا بھی بتایا جائے۔ لیکن یہ آوازیں الف اور بے کہہ کر نہیں بتانی چاہئیں بلکہ بَ۔ تَ۔ گَ۔ اور اَ کے ذریعہ شناخت کرانی چاہیے۔ یہاں استاد کو اردو حروف کے گروپ بنا کر آوازیں طلبا کو بتانا چاہیے۔ لیکن یہ آوازیں حرف کے بجائے فوراً الفاظ کی شکل میں لکھانا چاہیے۔ جیسے دَ کو دا اور بَ کو با اس طرح طلبا "دا" اور "با" کو مکرر لکھ کر فوراً جملے بنا لے گا یعنی دادا۔ بابا۔ آ۔ وغیرہ۔

حروف کی گروپ بندی اس طرح ہونی چاہیے۔ جیسے چپٹے حروف ب ت ٹ ث ف وغیرہ اَ۔ ل۔ مَ وغیرہ۔ نصف دائرہ حروف د ر وغیرہ اور پھر دائرے والے حروف ج۔ چ۔ ن ق۔ ی وغیرہ اس طرح سے طلبا لکھنا بہت آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ یہ سارے حروف لائن والے صفحے پر لکھوانے چاہئیں۔ تاکہ آسانی کے ساتھ لکھنا آجائے۔

جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آواز کا نام سکھاتے ہی اُس کا استعمال جملے کی شکل میں فوراً بتانا چاہیے اس کے لیے اِن آوازوں کو آ۔ او۔ اے اور ای کے ساتھ جوڑ کر ان کی شکل کی تبدیلی کے بارے میں بھی بتانا چاہیے۔ مثلاً چپٹے حروف جڑنے سے ہمیشہ چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ اور انھیں دونوں طرف سے جوڑا جا سکتا ہے جبکہ نصف دائرہ حروف نہ تو چھوٹے ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے بعد والے حروف سے جڑتے ہیں ـــــ اسی طرح یہ بھی بتانا ہو گا کہ آخر میں آنے والا ہر حرف پورا لکھا جائے گا۔

ہکار یعنی Aspreted آواز کے لیے ایک اصول بتانا چاہیے کہ دو چشمی ھ کسی بھی آواز کو Aspreted یا ہکار والی آواز بنا دیتی ہے۔ مثلاً ب کو بھ۔ ج کو جھ اور ک کو کھ۔ وغیرہ۔

اسی طرح چھوٹی ہ کو بھی چار شکلوں کی صورت میں بتانا مفید ہو گا۔ اس کی شکل اپنے استعمال کے مطابق تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب لفظ کے شروع میں آتی ہے تو ہرن ہاتھ اور ہے کی شکل میں لکھی جاتی ہے اور جب درمیان میں آتی ہے تو اس کی شکل کہنی دار ہو جاتی ہے جیسے کہنا۔ بہنا۔ وغیرہ جب آخر میں آتی ہے تو پوری آواز کے لیے تو کہنی دار ہوتی ہے لیکن آدھی آواز کے لیے آدھی ہی لکھی جاتی ہے جیسے نہ۔ کہ۔ یہ وغیرہ اسی طرح دونوں طرف سے نہ جڑنے کی شکل میں ہ اپنی شکل میں قائم رہتی ہے جیسے وہ۔ رہ آہ وغیرہ ہیں۔

کتاب کے سبق کے ساتھ ساتھ استاد کو حرف جوڑنا بتانے کے لیے بھی کوئی اصول مرتب کرنا چاہیے۔ تاکہ کسی ایک حرف کے جوڑ لینے کے بعد طالب علم اُس گروپ کے دوسرے حروف بھی آسانی سے جوڑنا سیکھ سکے۔ استاد کو ہر سبق میں چند نئے لفظ جملوں میں شامل کرنے چاہئیں اور آہستہ آہستہ آسان سے مشکل کی طرف قدم بڑھانے چاہیے۔ نئے الفاظ متعارف کراتے وقت اس لفظ کے مختلف استعمال بھی استاد کو بتانا چاہیے اور اُسی طرح کے جملے طالب علم سے بھی بنوانے چاہئیں۔ اس مشق کو بلیک بورڈ پر لکھ کر کرانا چاہیے۔

آوازوں کو جوڑ کر لفظ بنانے کے لیے اِس طرح بتایا جائے کہ کسی آواز میں آ کو جوڑ دینے سے وہ آواز لمبی اور پری آواز میں بدل جاتی ہے۔ جیسے ب + ا۔ با بن جائے گا اور ل + ا لا بن جائے گا اسی طرح ن + ا = نا، ج + ا = جا اور ا + ا = آ بن جائے گا۔

اب ان الفاظ کو جوڑ کر چھوٹے چھوٹے جملے بنوائے اور لکھوائے جائیں، جیسے : بابا تالا لایا وغیرہ۔

اسی طرح آوازوں کو "او" یعنی و کے ساتھ جوڑنا بتایا جائے۔ جیسے ب + و = بو۔ ل + و لو۔ ر + و = رو وغیرہ جنھیں بغیر پیش کے ذکر کیے ہی پڑھانا چاہیے۔ یہاں بو لو۔ رونا وغیرہ کے استعمال سے دوسرے بہت سے جملے بنوائے جا سکتے ہیں۔

او کے بعد اے یعنی یے کے ساتھ آوازوں کو جوڑنا بتایا جائے۔ جیسے ل + ے = لے۔ ک + ے = کے۔ د + ے = دے وغیرہ۔ اِس جگہ یہ بات بھی سمجھا دینا چاہیے کہ ے، حروف کے اس گروپ سے تعلق رکھتا ہے جس کے لفظ کے شروع یا درمیان میں آنے سے شکل بدل جاتی ہے اور اِسے چپٹے حروف کی طرح لکھا جاتا ہے، جیسے : بٹیا۔ میلا۔ ریلا۔ وغیرہ۔ اب جملے کچھ اور بڑے بنائے جا سکتے ہیں۔ جیسے آؤ۔ تارا کیلا لے لو۔ کیلا لے کے رانا کو دے آؤ۔

اسی طرح ای (یعنی چھوٹی ی) کو آوازوں کے ساتھ جوڑنا سکھایا جائے جیسے ک + ی = کی۔ ب + ی = بی۔ ن + ی = نی وغیرہ۔ اب جملے کچھ اور بڑے بن سکتے ہیں۔ گوری بولی روٹی دے دو۔ رانی کی بیٹی روتی آئی بولی آٹا دے دو۔

یہاں اس ای کو درمیان میں لانے سے اے کا دھوکا ہو سکتا ہے اس لیے اِی کے دُرمیانی استعمال میں نیچے چھوٹا کھڑا زیر لگانے سے گہری اِی کی آواز یعنی Deep Lower Sound میں بدل جائے گی۔ جیسے سیتا۔ میرا۔ دینا وغیرہ ہکار آوازیں یعنی Aspreted آوازوں کا استعمال حرکات یعنی Action کے لیے بالکل ویسے ہی ہوگا جیسے اب تک آوازیں جوڑی گئی تھیں جیسے بھالا۔ جھولا۔ ڈھیر یا دھیما وغیرہ۔

چھوٹی اوپری آواز اور چھوٹی نچلی آواز کے لیے زیر اور زبر لگا کر آوازیں بتانا چاہیے۔ جیسے بَنا۔ چَنا۔ ذَرا۔ لَگا وغیرہ۔

چھوٹی نچلی آوازوں کے لیے بِنا۔ دِیا۔ جِیا وغیرہ بتانا چاہیے۔

پیش کو آدھا اُو اور الٹے پیش کو دہرا اُو یعنی اُؤ بتانا چاہیے، جیسے سُنا۔ بُلا۔ چُنا وغیرہ اور دہرے اُو کے لیے بُو۔ گُو وغیرہ بتایا جانا چاہیے۔

دو حرفوں کو جوڑنا بتاتے وقت چھوٹی اوپری آواز یعنی زبر بتانا چاہیے۔ یہاں پر جزم کے نشان کی پہچان بھی کرانی چاہیے۔ اور یہ بھی بتانا چاہیے کہ اِس نشان کا مطلب ہے یہ حرف اپنے اگلے حرف سے جڑکر آواز دے گا۔ مثال کے طور پر کَبْ۔ اَبْ۔ رَکھْ وغیرہ۔

اسی طرح چھوٹی نچلی آواز کے لیے زیر کا استعمال بھی جزم کے ساتھ ہی بتانا چاہیے، جیسے دِنْ۔ بِنْ، دِلْ، گِرْ وغیرہ۔

یہاں تک پہنچ کر آخری آواز کا جڑا ہونا اور ساکن کا فرق بھی بتادینا چاہیے۔ اِس کے لیے بھی چھوٹی آواز کے ساتھ جڑنا اور لمبی آواز کے ساتھ جڑنا بتانا ہوگا۔ پہلی جزم والی آواز یعنی اَبْ۔ کَبْ۔ جِسْ۔ رُکْ اور دوسری لمبی آواز کے ساتھ یعنی آم۔ آب۔ سیکھ دھول۔ شور وغیرہ میں ساکن آوازوں کو بتانا چاہیے۔ تشدید طلبا کو اس طرح بتانا چاہیے کہ جس حرف پر یہ دہرا نشان "ّ" ہوگا اُس حرف کو دوبار پڑھا جائے گا۔ لیکن اُس آواز کا پہلا استعمال جزم کا ہوگا اور دوسرے استعمال کے لیے آواز آزاد ہوگی اُس پر چاہے زبر ہو زیر ہو یا پیش ہو مثلاً ــــ ابّا۔ ابّو اور اَبّی وغیرہ۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے طلبا کافی سیکھ چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کو زبر۔ زیر۔ پیش جزم اور تشدید کے ناموں کے ساتھ "ہجے" کی مشق کرائی جانی چاہیے۔

پڑھنے کے ساتھ طلبا لکھنا بھی سیکھ رہے ہوتے ہیں، تحریر سکھانے کے لیے استاد کو بلیک بورڈ پر لائن بناکر اُن پر ہی حلقے، دائرے اور الفاظ و جملے کی ساخت بتانا چاہیے۔ اور بار بار لکھنے کی ترغیب دینا چاہیے۔ طلبا کی خامیوں پر تصحیح کرنا بھی بہت ضروری ہے تاکہ وہ محض زبانی یاد رکھ کر الفاظ کی شکلوں کو گڈمڈ نہ کرسکیں۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق اور ص وغیرہ حرفوں کی کچھ ایسی شکلیں جو درمیانی استعمال میں یکساں نظر آتی ہیں اس کے فرق کو بلیک بورڈ پر واضح طور پر سمجھانا چاہیے۔ ف اور ق کو گولائی کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ جیسے نقش۔ قفل۔ نفرت وغیرہ۔ اور ع۔ غ۔ کے لیے سر کو تھوڑا چپٹا کر کے جیسے بغل، بعد، بُغض وغیرہ ــــ اور ص ض کے لیے ان کے شروع کے حصے کے ساتھ ایک شوشے کا اضافہ بتانا چاہیے۔ جیسے مصیبت۔ صدری۔ تصویر وغیرہ۔

اب طلبا پوری طرح عبارت پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو چکے ہوتے ہیں اور قاعدے کے بعد کی پہلی کتاب شروع ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کا انتخاب بھی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے بلکہ ذخیرۂ الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی کتاب ہی مرتب کرنی چاہیے جو ان طلبا کی ضرورت اور شوق کو پورا کر سکے۔ ان میں مشہور شعرا کی غزلیں، دلچسپ افسانے اور آسان مضامین شامل ہونے چاہئیں۔

جملے اور اشعار پڑھاتے ہی گرامر وجود میں آجاتی ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ جملوں کے ساتھ ساتھ قواعد بھی بتائی جائے۔ قواعد سکھانے کے لیے اسم وصفت کی تعریفیں نہیں رٹوانا چاہیے۔ اسم، صفت اور فعل کے علاوہ طالب علم کو اضافت اور عطف شروع میں ہی بتا دینا چاہیے کیونکہ یہ طلبا شامِ غزل اور دلِ ناداں سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں بس نام بتانے کی دیر ہوتی ہے۔ اسی طرح صبح وشام اور شمع و پروانہ بھی اِن کے لیے اجنبی نہیں ہوتے۔

طالب علموں کو کلاس شروع ہوتے ہی اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں ضرور بتانا چاہیے اور جب زبان آجائے تو اردو کی پوری تاریخ کہانی کی شکل میں بتانی چاہیے تاکہ زبان کے بارے میں طلبا کو اگر کوئی بدگمانی ہو تو وہ بھی دور ہو جائے۔ اور وہ اردو کی تمام تحریکوں سے مختصر طور پر واقف بھی ہو جائے۔

چونکہ یہ طلبا دوسری زبان سے واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو نئی زبان آسانی سے سکھائی جا سکتی ہے اور متذکرہ قاعدے سے وہ بہت جلد اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھ سکتے ہیں۔

آخر میں صرف ایک بات عرض کرنی ہے کہ مختلف حضرات مختلف طریقوں سے اردو پڑھاتے ہیں۔ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے کیونکہ طلبا کی ضرورت کے تحت کسی بھی اصول کو استاد اپنے طور پر بدل کر بھی آسانی سے پڑھا سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ ایک کلاس میں ایک ہی طریقہ استعمال کیا جائے اور بنیادی زور اردو سیکھنے میں دلچسپی پیدا کرنے پر دینا چاہیے۔

معین الدین

غیر ملکی طلبہ کے لیے نصاب

زبان کی تعلیم میں نصاب کی خصوصی اہمیت ہے۔ مادری زبان کا نصاب ہو جا ہے کسی بیرونی زبان کا نصاب، ایک عمدہ نصاب کے بغیر تدریس میں کامیابی ممکن نہیں، کامیاب تدریس ایک موزوں لائحہ عمل پر مبنی ہے جس کے تحت اغراض و مقاصد کا تعین کیا جاتا ہے، پھر ان مقاصد کے حصول کے لیے مناسب اقدام کیے جاتے ہیں۔ انہی اقدامات میں نصاب بھی ایک اہم قدم ہے۔

مادری زبان کے نصاب کی تیاری میں جو اصول کارفرما ہوتے ہیں ان میں بڑی حد تک اتفاق رائے نظر آتا ہے۔ لسانی مہارتوں کی نشو و نما کے علاوہ ان میں طلبا کی ضروریات، ماحول کے تقاضے اور قومی اقدار کا فروغ پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اس کو شخصیت سازی کا ایک وسیلہ تصور کیا جاتا ہے لیکن بیرونی زبان کی نوعیت اور محرکاتِ آموزش چونکہ مختلف ہوتے ہیں اسی لیے غیر ملکی طلبا کے لیے نصاب تیار کرتے وقت ان اختلافات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ محرکات کے اختلافات مختلف سطحوں پر نظر آتے ہیں۔ مدرسے کی سطح پر محرکات بالغوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ معیار کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ معیار کا صحیح تعین کرنے کے بعد ہی نصاب مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع پر آموز کار کی عمر، لیاقت اور ضروریات کے علاوہ ان کے لسانی، جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔

عمومی حیثیت سے غیر ملکی طلبا کے لیے نصاب کا موضوع بہت وسیع ہے یعنی اس کے تحت تمام بیرونی زبانوں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے لیکن زیرِ نظر مضمون میں چونکہ غیر ملکی طلبا کے لیے اردو کا

نصاب پیش نظر رکھا گیا ہے اس لیے اس کو ضرورت کے تحت محدود رکھا گیا ہے۔

غیر ملکی طلبا کے لیے تدوین نصاب کی ماضی میں جو کوششیں کی گئی ہیں ان کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر غیر ملکی طلبا کے لیے اردو کے جو نصاب مرتب کیے گئے انھیں کیفیت کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک وہ نصاب جو قدیم اور فرسودہ ہے اور برطانوی عہد سے وابستہ ہے وہ نصاب ایک ایسے عہد کی غمازی کرتا ہے جس میں آقا اور غلام کا رشتہ تھا۔ برطانیہ کا ہر باشندہ خود کو سرکارِ برطانیہ کا نمایندہ تصور کرتا تھا۔ وہ جن مقاصد کے تحت ہندوستانی سیکھنا چاہتا تھا وہ بذاتِ خود اقتدار پر مبنی تھے۔ ان کے محرکات بھی اقتدار کی سمت رہنمائی کرتے تھے، وہ انسانی روابط پر نہیں سامراجی تقاضوں پر مبنی تھے۔ لہٰذا ان کے لیے ایسی کتابیں تیار کی گئیں جو اپنے مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے اپنے عہد کی عکاسی کرتی تھیں۔ برطانوی آموزکار کو ان کتابوں میں جو طرزِ تخاطب سکھایا جاتا تھا وہ تحکم پر مبنی تھا۔ مثال کے طور پر ایک انگریز کسی ہندوستانی سے مخاطب ہوتا تھا تو تم سے خطاب کرتا تھا اور خود کے لیے ہم کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ لفظ 'تم' اور 'ہم' ہماری زبان میں بہت مستعمل ہیں لیکن اگر کسی مخصوص سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو ان کی معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ اُس دور کی درسی کتب میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں تحکم کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور ہندوستانیوں کو کم تر اور حقیر سمجھا گیا ہے۔

دوسرا نصاب ایسی کتابوں پر مشتمل ہے جو معاصر تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ ان میں تحکم کا انداز نہیں اور نہ ہی ایسے جملے ملتے ہیں جن سے دقیانوسی ماحول جھلکتا ہو۔ ان کتابوں میں ہندوستانیوں کے لیے تحقیر آمیز الفاظ نہیں ملتے اور راجاؤں، نوابوں اور شہنشاہوں کے عیش و عشرت کا مظاہرہ بھی نہیں ہوتا۔ قدیم اور فرسودہ نصاب کے مقابلے میں یہ نصاب جدید تو ضرور ہے لیکن اس میں زبان کو مقصود بالذات تصور کیا گیا ہے اور بنیادی طور سے یہ نصاب ان انگریزوں کے لیے تیار کیا گیا تھا جنھوں نے کلاسیکی زبانوں کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب زندہ اور مردہ زبان میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا اور مواد مضمون کا انتخاب کرتے وقت انسانی نفسیات اور روابط کے بجائے قواعد کی منطق پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

تیسرے قسم کا نصاب وہ ہے جو صوتیات کے اصولوں کے تحت تیار کیا گیا جس میں زیادہ زور لسانیات پر دیا گیا۔ لسانیات کی بنیاد پر نصاب تیار کرنے والوں کے ذہن میں یہ تصور کارفرما ہا کہ زبان سیکھنے کے لیے صوتیات کا علم ضروری ہے۔ لہٰذا صوتیات کا نظام اور زبان میں استعمال ہونے والی آوازوں کی امتیازی خصوصیات کا علم حاصل کیے بغیر زبان نہیں سیکھی جا سکتی۔

غیر ملکی طلبا کے لیے نصاب مرتب کرنے کی ماضی میں جو کوششیں کی گئیں ان کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حالیہ برسوں میں تدوین نصاب کی جو صورت رہی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تاکہ ان کے تجزیے سے کچھ مفید نتائج برآمد کیے جا سکیں۔

حالیہ برسوں میں بیرون ملک نصاب مرتب کرنے کی ایک نمایاں کوشش رالف رسل نے کی ہے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے زیر نگرانی انگریز طلبا کے لیے اردو کا ایک جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اس نصاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بیرونی زبان سیکھنے میں انسانی احترام کو ملحوظ رکھا جائے اور مواد کا انتخاب کرتے وقت ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کی جائے جو نظری کم ہوں اور عملی زیادہ۔ اس طرح اس کے ذریعے اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ زندگی کتاب سے زیادہ دقیع، کارآمد اور بامعنی ہے۔

یہ نصاب ان انگریزوں کے لیے مرتب کیا گیا ہے جو اس غرض سے اردو سیکھنا چاہتے ہیں کہ زبان کے وسیلے سے وہ ہندوستان کی تہذیب تک رسائی حاصل کر سکیں اور اس کے حصول کے لیے اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان کے وسیلے سے مقامی باشندوں کے ساتھ ان کا رابطہ قائم ہو اور وہ برابری کی سطح پر ایک دوسرے سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کر سکیں، گفتگو کرتے وقت ایک دوسرے کے درمیان بے تکلفی کا ماحول ہو اور مجموعی برتاؤ سے یہ بات جھلکتی ہو کہ بیرون ملک کا ایک باشندہ مقامی باشندے سے اس کی اپنی زبان میں گفتگو کرنا چاہتا ہے اور اس کے ذریعے وہ مقامی تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے

رالف رسل نے دو جلدوں میں یہ اساسی کورس مرتب کیا ہے۔ پہلی جلد میں زبان کی تمام بنیادی مہارتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گفتگو اور بات چیت، پڑھائی، تفہیم عبارت اور لکھائی، تشریحی نوٹ اور ترتیب وار مشقیں اس نصاب میں شامل ہیں۔ اس جلد میں جو اسباق شامل کیے گئے ہیں وہ موضوعات

کے اعتبار سے روزمرہ زندگی سے مربوط ہیں۔ ان موضوعات کو پیش کرنے کے لیے سوال وجواب اور مکالمے کی تکنیک اختیار کی گئی ہے۔ اس کے اندر خود نوشت مسلسل نثری عبارتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ اسباق کی تقسیم منطقی ہے۔ اسباق کے انتخاب میں بتدریج طوالت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

دوسری جلد میں پہلی جلد کے مواد کا اعادہ، انشا اور معاصر موضوعات پر اسباق شامل ہیں۔ ہر متن کے ساتھ تشریحی نوٹ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سلسلۂ تعلیم وترقی سے بھی چند کتابچے مطالعے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ میونسپلٹی، ضلع کی سرکار، چناؤ کے بھید، شہری حقوق اور فرایض، اچھا ہندوستانی اور امالی ان میں سے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ موضوعات بالغوں کی دلچسپی کے ہیں اور ان میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ بھی بالغوں کی دلچسپی کا باعث ہے۔ آخر میں ان غیر ملکی طلبا کے لیے جو اس نصاب کی تکمیل کے بعد شعر و ادب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں دو ریڈرس سرسری مطالعے کے لیے تجویز کی ہیں۔

١۔ ادبی نثر کے مطالعے مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ

٢۔ ادبی نثر و نظم کے مطالعے مرتبہ: چودھری محمد نعیم

اس کے علاوہ مغربی جرمنی، روس، کینیڈا اور امریکہ میں بھی مختلف اداروں کی جانب سے غیر ملکی طلبا کے لیے اردو کا نصاب مرتب کیا گیا ہے۔ بعض اداروں میں پابندی کے ساتھ اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے اور بعض جگہوں پر کسی اور مضمون کے ساتھ ساتھ اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ اس کے لیے عملی اردو Functional Urdu کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس نصاب کے ذریعے طلبا سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ وہ لغت کی مدد سے اخبار پڑھ سکیں۔ بارکر نے اس سلسلے میں اردو کی الفاظ شماری کی ہے اور چودھری نعیم نے افعال شماری کی خدمت انجام دی ہے۔

وسکانسن یونیورسٹی میں انڈین اسٹڈیز کے تحت پروفیسر نارنگ نے جو نصاب تیار کیا ہے اس کے اندر موضوعات میں وسعت اور تنوع کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کے پیشِ نظر عوامی ادب، ناول، حکایات، مکاتیب، سوانحی مضامین، تقاریر اور اخباروں کے تراشے بھی نصاب میں داخل کیے گئے ہیں۔ اس نصاب میں دقیق الفاظ اور اصطلاحات کی فہرست بھی فراہم کی گئی ہے۔ تشریحی نوٹ بھی ہیں اور صرفی اور نحوی پہلوؤں کی طرف اشارے بھی۔

غیر ملکی طلبا کو اردو پڑھنا لکھنا سکھانے کی ہندوستان اور پاکستان میں جو کوششیں کی گئی ہیں اور جس قسم کے نصاب مرتب کیے گئے ہیں ان میں کوئی تال میل نظر نہیں آتا۔ بعض اداروں نے پڑھائی کا نصاب خود تیار کرایا ہے اور بعض نے دیگر نصابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی طلبا کے لیے اردو کا نصاب تیار کرنے کی کوئی ایسی کوشش نہیں ہوئی جس میں معیار بندی کو ملحوظ رکھا گیا ہو اور رہنما اصولوں کی پابندی کی گئی ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ بعض مقامات پر غیر ملکی طلبا کو بچوں کے قاعدے پڑھائے جاتے ہیں جو نہ تو موضوعات کے اعتبار سے غیر ملکی بالغوں کے لیے موزوں ہیں اور نہ زبان و بیان کے اعتبار سے بالغوں کے لیے مناسب ہیں۔

مذکورہ بالا جائزے کے بعد یہ مناسب ہوگا کہ بیرونی طلبا کے لیے تدوین نصاب کے موضوع پر عمومی حیثیت سے بحث کی جائے۔

غیر ملکی طلبا کے لیے نصاب مرتب کرنے سے قبل معیار کا تعین ضروری ہے۔ مرتب کو اس بات کی شعوری کوشش کرنی چاہیے کہ غیر ملکی طلبا کے معیار کا ٹھیک اندازہ لگائے۔ معیار ابتدائی ہو سکتا ہے، یا اعلا یا درمیانی، ان کے لیے الگ الگ نصاب مرتب کیا جا سکتا ہے۔

معیار کا تعین کرنے کے بعد مقاصد کا موثر بیان ضروری ہے۔ مقاصد کے پیش نظر نصاب کے خد و خال واضح کیے جاتے ہیں اور طلبا کی ضروریات اور لسانی تقاضے اور سماجی ماحول کے تحت اس میں رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ مقاصد کی وضاحت کے ضمن میں مناسب ہو اگر نصاب کا مرتب خود سے یہ سوال کرے کہ اس نصاب کے ذریعے وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

عام طور پر غیر ملکی طلبا کو بیرونی زبان سکھانے کے درج ذیل مقاصد بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ بولنا سکھانا:۔ بولنا سکھانے کا مقصد یہ ہے کہ آموزکار زبان کو صاف صاف اور صحت کے ساتھ بول سکے اور دوسروں کی گفتگو سن کر مفہوم اخذ کر سکے۔ اور ذخیرۂ الفاظ پر قدرت حاصل کر سکے۔ ذخیرۂ الفاظ سے متعلق جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ تین سطح پر جمع ہوتا ہے۔ بول چال، پڑھائی اور لکھائی کی سطح پر۔ کوئی شخص بول چال میں جتنے الفاظ استعمال کرتا ہے وہ سب کے سب مطالعے کے تجربے میں نہیں آتے۔ اسی طرح جس قدر الفاظ مطالعے کے تجربے میں آتے ہیں وہ سب کے سب تحریر میں استعمال نہیں ہوتے۔ لیکن اس بات سے تمام ماہرین تعلیم

متفق ہیں کہ لفظ اگر بول چال میں مستعمل ہے تو پڑھائی اور لکھائی کے دوران اس لفظ کا استعمال سہل ہو جاتا ہے اور تفہیم میں بھی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

بولنے کی مہارت میں پختگی پیدا کرانے کے لیے ترتیب وار مشقیں فراہم کرنی چاہئیں۔ ہر زبان کے سیکھنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ مقامی باشندوں کے ساتھ سہولت کے ساتھ گفتگو کر سکے۔ بیرونی ملک میں تقریری عمل میں مزید تقویت پہنچانے کے لیے ٹیپ اور لنگوافون سے استفادہ کرنے کا کام بھی نصابی مشاغل میں شامل ہونا چاہیے لیکن اندرون ملک ان سبھی وسائل کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے اس لیے کہ مطلوبہ زبان بولنے والوں کا ایک پورا سماج موجود ہوتا ہے اور آموزکار اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

بیرونی زبان سیکھنا ایک ایسا عمل ہے جس میں سیکھنے والا تقریباً صفر درجے سے شروع کرتا ہے۔ آموزکار کی اپنی زبان میں لسانی عادتیں کافی پیچیدہ ہوتی ہیں۔ نئی زبان سیکھنے میں کبھی وہ معاون ہوتی ہیں اور کبھی مداخلت کرتی ہیں۔ ایک اعتبار سے آموزکار بالکل نئی زبان بھی نہیں سیکھ رہا ہوتا ہے بلکہ اپنی زبان کی تکنیک کو وہ دوسری زبان میں استعمال کرتا ہے لہٰذا رواجی یعنی مادری زبان بولنے میں جہاں مداخلت کرتی ہے وہاں نصاب کے اندر واضح اشارے ہونے چاہئیں تاکہ آموزکار شعوری طور پر مداخلت کے مرحلے پر قابو پا سکے۔

۲۔ پڑھنا سکھانا۔ پڑھائی کے لیے موضوع اور مواد کا انتخاب کتاب کا ایک دوسرا اہم مسئلہ ہے۔ موضوعات کا انتخاب اور موضوعات کا تنوع، بڑی حد تک متنازعہ فیہ ہے۔ بعض مرتبین نے موضوعات کا انتخاب کرتے وقت آموزکار کی نفسیات اور ان کی ضروریات کا خیال نہیں رکھا چنانچہ نصاب میں ایسے موضوعات بھی شامل ہیں جو اساطیری ادب سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اب یہ فکر کا مقام ہے کہ یوروپ، امریکہ اور روس کے وہ بالغ جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں، اساطیری ادب میں یا معاصر زندگی میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کلاسیکی ادب میں زبان و بیان کے جو نمونے دستیاب ہیں وہ بول چال میں نہیں ملتے۔ جدید ذہن کے نوجوانوں کو نئی حیثیت کی تلاش رہتی ہے اور نئی حیثیت جدید زندگی کے مظاہر میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ شہری زندگی کے خدوخال۔ بازار، ریستوران، کافی ہاؤس، دیہات کی ابھرتی ہوئی تصویر۔ ندی، پہاڑ، لہلہاتی ہوئی فصلیں،

بجلی پانی کا انتظام اور بدلتے ہوئے موسم اور مناظر، بکھرتے ہوئے خاندان، جمہوری طرزِ حکومت اور امن و سلامتی کی سعی سے لے کر ستاروں کی جنگ تک بے شمار موضوعات ہیں جن میں غیر ملکی طلبا کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔

موضوعات کے انتخاب کے بعد نصاب کا دوسرا مسئلہ مواد کے انتخاب کا ہے۔ مواد کے انتخاب میں دو باتیں اہم ہیں، ایک لسانی مواد اور دوسرا تصوراتی مواد۔ لہٰذا مواد کے انتخاب میں ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور موضوعی مواد کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ موضوعی مواد The matic matter سے مراد ہے کہ پوری عبارت تخیل کے ایک ہی دھاگے میں پروئی ہوئی ہو اور پورے نفسِ مضمون میں ایک ہی تصور کی کارفرمائی ہو۔ لہٰذا غیر ملکی طلبا کے لیے نصاب تیار کرتے وقت بہت احتیاط کے ساتھ مواد کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے کسی خاص قسم کی عبارت درکار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر پڑھائی کے سبق سے عبارت کی تفہیم مقصود ہے تو معلوماتی عبارت کا انتخاب کرنا چاہیے اور اگر سرسری مطالعہ مطلوب ہے تو کہانیاں زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ لہٰذا مقاصد کو محدود اور متعین کرنا ضروری ہے۔ محدود مقاصد کا انتخاب کسی قدر مشکل ہوتا ہے لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مرکز مل جاتا ہے اور ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے۔ ارتکاز کے باعث آموز کار کو ٹھیک معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا سیکھنا ہے۔

نصاب کے اندر قواعد پڑھانے کے لیے بھی واضح اشارے ہونے چاہئیں لیکن قواعد علیحدہ سے پڑھانا مناسب نہیں۔ عملی قواعد Functional Grammer کا طریقہ زیادہ مناسب سمجھا جاتا ہے جس کے مطابق بولنا یا پڑھنا سکھانے کے دوران ہی قواعد پڑھا دینی چاہیے لیکن اعادے کے لیے کتاب میں ایسی مشقیں فراہم کرنی چاہئیں جن سے عملی قواعد پڑھانے میں سہولت ہو۔

۳۔ لکھنا سکھانا: لکھائی کی بنیادی مہارت پیدا کرانا بھی نصاب کا ایک اہم [illegible] ہے لہٰذا نصاب میں تحریری مشاغل کی واضح نشاندہی ہونی چاہیے۔ نقل نویسی بالغوں کے لیے موزوں ہو گی یا نہیں، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا لیکن املا نویسی، خط نویسی، رقعہ نویسی اور ہلکے پھلکے بیانیہ اسلوب کے مختلف نمونوں کو نصاب میں داخل کرانا چاہیے۔ بیرونی زبان سے مادری زبان میں اور مادری زبان سے بیرونی زبان میں ترجمے کا کام بھی نصاب کا جزو ہونا چاہیے۔

پڑھنا سیکھنے کے بعد غیر ملکی طلبا کی عام طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ لکھنا سیکھ لیں اور اپنے ہاتھ سے اپنے مقامی دوستوں کو خط لکھ سکیں۔ کبھی کبھی وہ چھپی ہوئی عبارت کے مقابلے میں ہاتھ کی لکھی ہوئی صاف عبارت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

غرض بحیثیت مجموعی تدوین نصاب کے وقت یہ مقصد پیش نظر رہنا چاہیے کہ آموز کار صحیح تلفظ اور مناسب لب و لہجے کے ساتھ مطلوبہ زبان بول سکے، لفظیات پر اس کو قدرت حاصل ہو، جملے کی صرفی و نحوی ساخت سے واقف ہو جائے۔ اس موقع پر اس بات کا ذکر بھی بر محل ہوگا کہ مرتب ایسا نصاب تیار کرے جس سے آموز کار کی لسانی لیاقت کو عملی رُخ دے سکے۔ یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ نصاب محض درسی کتاب کا نام نہیں بلکہ اس کے اندر وہ تمام مشاغل شامل ہونے چاہئیں جو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سکھانے کے لیے ضروری سمجھے جائیں۔

جدید نصاب کا ایک تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اندر 'اندازۂ قدر' Evaluation کا بھی التزام ہو۔ یعنی جو کچھ پڑھایا جائے اس کی جانچ بھی ہوتی رہے تاکہ یہ اندازہ ہوتا رہے کہ کس حد تک اغراض و مقاصد کا حصول ہو پایا ہے اور کس لحاظ سے تکمیل مقاصد میں کوتاہی رہ گئی ہے، اگر ایسا ہے تو اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انتخاب مواد میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو یا طریقۂ تدریس میں کوئی نقص رہ گیا ہو؟ اگر بیرونی زبان کا استاد، ان رموز سے آشنا ہو جائے تو نتائج کی بنیاد پر وہ طریقۂ تدریس اور انتخاب مواد میں اصلاح کر سکتا ہے۔

مرزا خلیل احمد بیگ

اردو بہ طورِ غیر مادری زبان اور اس کا نصاب

زبان اظہارِ خیال کا ایک بہترین وسیلہ اور موثر ذریعہ ہے۔ قدرت نے ہر انسان کو زبان سیکھنے کی صلاحیت عطا کی ہے جو حیوانوں میں مفقود ہے۔ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان جو زبان سیکھتا ہے، اس کا فیصلہ گرد و پیش کا ماحول اور معاشرہ کرتا ہے۔ انسان جس معاشرے میں پلتا بڑھتا اور پرورش پاتا ہے وہ اسی معاشرے اور ماحول میں بولی جانے والی زبان اختیار کرتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تحصیلِ زبان سماجی تعامل یعنی Social Intraction کا نتیجہ ہوتی ہے، اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس طرح چلنا یا سونا، جبلی عادات ہیں، اس طرح زبان کی تحصیل جبلی عادت نہیں۔ زبان نہ تو جبلی طور پر سیکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی موروثی طور پر اس کی تحصیل ممکن ہے۔ بلکہ یہ ایک سماجی اور تہذیبی دین ہے جو سماج کے ہر فرد کو بہ آسانی اور بغیر کسی شعوری کوشش کے حاصل ہو جاتی ہے۔ جو زبان بچہ ماحول اور معاشرے میں رہ کر بغیر کسی رسمی یا مکتبی تدریس و تربیت کے حاصل کرتا ہے وہ اس کی پہلی زبان کہلاتی ہے۔ اسی زبان کو مادری زبان بھی کہتے ہیں۔ بچے کو اپنی مادری زبان پر قدرت صغر سنی ہی میں حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اس زبان میں کی جانے والی گفتگو کو سمجھ سکتا ہے، اسے بول سکتا ہے اور اس کی قواعد، نحوی ترکیب اور الفاظ کے استعمال کا وہ پوری حد تک شعور رکھتا۔ جیسے جیسے وہ سنِ شعور کو پہنچتا جاتا ہے اس کی زبان میں پختگی آتی جاتی ہے۔

تحصیلِ زبان دراصل لسانی مہارتوں یعنی Language Skills کی مشق کا دوسرا

نام ہے۔ لہٰذا جتنی اچھی اور مکمل یہ مشق ہوگی اتنی ہی بہتر زبان کی تحصیل ہوگی۔ زبان کا سننا (سمجھنا) اور بولنا دو اہم لسانی مہارتیں ہیں۔ دو اور لسانی مہارتیں پڑھنا اور لکھنا ہیں۔ یہ چاروں مہارتیں تحصیل و تدریس زبان کے بنیادی عناصر ہیں۔ اِن مہارتوں کی مشق، بچّہ بتدریج حاصل کرتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے وہ زبان کا سننا اور سمجھنا سیکھتا ہے، پھر بولنا۔ اس کے بعد رسمی اور مکتبی تربیت کے ذریعے وہ پڑھنا سیکھتا ہے، پھر لکھنا بھی سیکھ جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص نے پڑھنا اور لکھنا نہیں سیکھا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ زبان نہیں جانتا۔ ایسے شخص کو ان پڑھ یا ناخواندہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن بے زبان نہیں کہہ سکتے، کیونکہ، ماحول و معاشرے میں رہ کر مادری زبان تو اس نے بچپن ہی میں سیکھ لی تھی۔ اگر کسی زبان کی تعلیم بہ طورِ مادری زبان دی جاتی ہے تو استاد کی تمام تر توجہ پڑھنے اور لکھنے کی مشق پر مرکوز ہوتی ہے، کیوں کہ زبان کا سننا (سمجھنا) اور بولنا تو بچّہ پہلے ہی سیکھ چکا ہوتا ہے۔ لیکن غیر مادری زبان کی حیثیت سے کسی زبان کی تدریس میں ان چاروں مہارتوں کی تدریس لازمی قرار پاتی ہے۔ مادری اور غیر مادری زبان کی حیثیت سے کسی زبان کی تحصیل و تدریس میں جو بنیادی فرق موجود ہے اس کا اثر درسی کتب کی تیاری، تدریسی مواد کے انتخاب، نصابات کی تیاری اور طریقۂ تدریس پر بھی پڑتا ہے۔ غیر مادری زبان کا نصاب مادری زبان کے نصاب سے قطعی طور پر مختلف ہونا چاہیے، کیونکہ غیر مادری زبان کی حیثیت سے زبان کی تدریس میں مبتدیوں کو از سرِ نو زبان سکھانا پڑتی ہے۔

غیر مادری زبان کی تحصیل کے کئی محرکات ہیں، مثلاً غیر مادری زبان کی تحصیل کبھی تو مذہبی تقاضوں کے تحت عمل میں آتی ہے، اور کبھی سماجی، تہذیبی اور عملی ضروریات کے پیشِ نظر۔ اور کبھی محض جذباتی لگاؤ کی خاطر۔ کبھی محض مصلحتِ وقت یا سیاسی ضرورت اور دباؤ بھی غیر مادری زبان کی تحصیل کا باعث بنتا ہے۔ غیر مادری زبان کی تحصیل اعلیٰ تعلیمی اور علمی ضروریات کے تحت بھی ممکن ہے، یا محض ملکی یا بین الاقوامی سطح پر رابطے کی غرض سے غیر مادری زبان سیکھی جاتی ہے۔ جو لوگ اردو کو غیر مادری زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں ہمیں ان کے تحصیل زبان کے محرکات کا پتا لگانا چاہیے، کیونکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اگر زبان سیکھنے کا کوئی خاص محرک سامنے ہو تو وہ زبان بہت جلد سیکھی جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اُسے سیکھتے ہیں۔ مثلاً اگر تحصیل زبان کا یہ محرک سامنے آئے کہ

اردو سیکھنے سے روزگار ملنے میں آسانی پیدا ہوگی تو لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو سیکھیں گے اور جلد سیکھیں گے، اور اردو سیکھنے میں ان کا جی بھی خوب لگے گا۔ لیکن فی زمانہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج کل اردو زبان کی تحصیل کے محرکات محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو سیکھنے کی سیاسی طور پر نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی دباؤ۔ اردو سیکھنے کے سماجی، علمی اور تعلیمی محرکات بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ہی ایک مذہبی تنظیم نے بہ شمول ہندی، ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کثیر تعداد میں اسلامی لٹریچر شائع کر کے اردو زبان کی تحصیل کے مذہبی محرک کو بھی مسدود کر دیا ہے۔ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں اردو کے ذریعے اعلا تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ اردو سائنس اور ٹکنالوجی کی بھی زبان نہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ کسی زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں تمام سائنسی علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے سے دی جاتی تھی) لہٰذا اردو زبان کی تحصیل کے محرکات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو سیکھنے کے محرکات میں اب تک ادبی اور تہذیبی محرک ہی اہم اور مقبول رہا ہے۔ دہلی، یو۔پی، ہماچل پردیش اور پنجاب کے بعض سرکاری اور نیم سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں اردو زبان کی تدریس کے جو سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورسز ان دنوں قائم ہیں، اور اُن میں جو غیر اردو داں زیر تعلیم ہیں، اُن سے اگر پوچھا جائے کہ وہ کون سا محرک ہے جس نے انھیں اردو سیکھنے پر مجبور کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ اُن میں سے تقریباً ۹۵ فی صدی اردو سیکھنے والوں کا جواب یہ ہوگا کہ اردو چونکہ ایک نہایت شیریں اور پُر تکلف زبان ہے اس لیے وہ اُسے سیکھنا چاہتے ہیں، نیز اس کے ادب میں اتنی کشش، دل کشی اور رنگینی ہے جس نے انھیں اردو سیکھنے پر مجبور کیا۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ وہ اس لیے اردو سیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے سیکھنے سے تلفظ درست ہو جاتا ہے اور گفتگو کے آداب آ جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اردو کے ادبی اور تہذیبی محرک سے تعلق رکھتی ہیں۔ ورنہ آج کے دور میں اردو زبان کی تحصیل کے دوسرے تمام محرکات کا دائرہ کافی حد تک محدود ہو گیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاوقتیکہ کسی زبان کے سیکھنے کا محرک سامنے نہ ہو اس وقت تک لوگ اس زبان کو سیکھنے کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اس کی تحصیل میں وقت بھی کافی صَرف ہوتا ہے۔ غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم و تدریس کے فروغ

کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے محرکات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ موجودہ سہ لسانی فارمولے میں بھی ضروری ترمیم کر کے مختلف ریاستوں میں غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے کافی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ غیر اردو داں یا علاقائی زبانوں کے طلبہ کو اس امر کے لیے مجبور نہ کیا جائے کہ وہ سہ لسانی فارمولے کے تحت تیسری زبان کے طور پر سنسکرت یا ہندی کا انتخاب کریں۔ بلکہ انھیں اس بات کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ تیسری زبان کی حیثیت سے اگر وہ چاہیں تو اردو کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ بہت سی غیر ہندی ریاستوں میں تیسری زبان کی حیثیت سے ہندی کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور بہت سی ہندی ریاستوں میں دوسری یا تیسری زبان کے خانے میں اردو کو سنسکرت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ کئی ہندی ریاستوں میں تیسری زبان کی حیثیت سے اردو کو بالکل ہی غائب کر دیا گیا ہے۔ ان تمام صورتوں میں غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھنے کے امکانات بہت ہی محدود ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہماچل پردیش نے جو قدم اٹھایا ہے وہ ہر لحاظ سے لائقِ ستائش ہے۔ ہماچل پردیش کے تمام اسکولوں میں تیسری زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اردو ہماچل پردیش کے تمام اسکولوں میں نویں اور دسویں جماعت میں لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ ہماچل پردیش میں مسلمانوں کی تعداد صفر کے برابر ہے۔ ہماچل پردیش کی دوسری زبان انگریزی اور پہلی زبان ہندی ہے۔ ہماچل پردیش سے قطع نظر، آزادی کے بعد ہندوستان میں غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تحصیل و تدریس کا دائرہ نہایت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

غالباً اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تدریسِ زبان ایک سرگرمی یعنی Activity کا نام ہے اور تحصیلِ زبان ایک عمل یعنی Process ہے جس سے ہو کر ہر زبان سیکھنے والا گذرتا ہے۔ تدریسِ زبان کے لیے تحصیلِ زبان کے Process کا علم ضروری ہے جس کی کئی سطحیں ہیں۔ اس کی پہلی سطح تکلمی اصوات کی ادائگی اور ان کی شناخت پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ان اصوات

کی ترتیب وتنظیم کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ دوسری سطح الفاظ کی ہے جس میں اُن کی تشکیل اور بامعنی ترتیب شامل ہے۔ تیسری سطح جملوں کی ساخت، ان کی ترتیب وتنظیم اور اُن کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ چوتھی سطح رسم خط کی مشق و مہارت ہے۔ اور پانچویں اور آخری سطح مختلف سیاق وسباق اور گوناگوں صورتِ حال میں زبان کے برجستہ، برمحل اور بامحاورہ استعمال سے متعلق ہے۔ ان تمام امور کی تدریس، زبان کی تدریس سے عبارت ہے جس کے کچھ اصول بھی ہیں۔ رابرٹ لیڈو نے تدریس زبان کے جو اصول وضع کیے ہیں ان کا بڑی حد تک اطلاق اردو زبان کی تدریس پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کے چند بنیادی اصولوں کا ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا۔

غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کا سب سے پہلا اصول یہ ہونا چاہیے کہ زبان کے سننے اور بولنے کی مشق پہلے کرائی جائے اور پڑھنا اور لکھنا اس کے بعد سکھایا جائے۔ تدریس زبان کے جدید سمعی لسانی یعنی Audio Lingual نظریے کی بنیاد بھی اسی اصول پر قائم ہے۔ لسانیات کی رو سے تکلمی زبان ہی اصل زبان ہے اور تحریر اس تکلمی زبان کی صوری نقل ہے۔ زبان اپنے تمام تر مظاہر کے ساتھ تکلمی صورت ہی میں مکمل سمجھی جاتی ہے، کیونکہ تلفظ لب و لہجہ، اتار چڑھاؤ، اور مختلف کیفیات کے اظہار اور زور وغیرہ کو تکلمی زبان ہی کے ذریعے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام باتیں تحریر میں نمایاں نہیں ہوسکتیں۔ تحریر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن جب تک کہ زبان کی تکلمی صورت سے مبتدی بہ خوبی روشناس نہ ہو جائے اس وقت تک اُسے لکھنے اور پڑھنے کی مشق نہیں کرانی چاہیے۔ زبان کی تکلمی صورت پر قدرت حاصل کرنے کے لیے زبان کی صوتی نقل یا تقلید بہت ضروری ہے۔ طلبہ کو صوتی تقلید کے جتنے زیادہ مواقع ملیں گے، اتنی ہی زیادہ اچھی طرح وہ زبان کا بولنا سیکھ لیں گے۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ نمونہ یا ماڈل جس کی طلبہ نقل یا تقلید کریں وہ ایک معیاری ماڈل ہونا چاہیے، کیونکہ اگر ماڈل ہی غیر معیاری ہو تو طلبہ کی نقل بھی غیر معیاری اور ناقص ہوگی اور وہ اردو کا صحیح تلفظ اور لب و لہجہ نہیں سیکھ سکیں گے۔ اس سلسلے میں اہل زبان کا

ماڈل سب سے زیادہ مناسب اور قابل قبول تصور کیا جانا چاہیے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو کی تعلیم جب غیر مادری زبان کی حیثیت سے دی جائے تو اس کی تدریس کی ذمّے داری ایسے لوگوں کے سپرد کی جائے جو اہلِ زبان ہوں یعنی جو اردو کو مادری زبان کے طور پر بولتے ہوں یا ایسے لوگ جو اردو کو مادری زبان کے طور پر تو نہ بولتے ہوں لیکن انھیں اردو زبان پر اعلا قدرت حاصل ہو لیکن ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جنھیں کسی غیر زبان پر اہلِ زبان جیسی قدرت اور مہارت حاصل ہو۔ زبان کی سمعی اور تکلمی مشق و مہارت کے لیے جدید آلات مثلاً لنگوا فون ٹیپ یا ڈسک ریکارڈنگ اور لینگوئج لیباریٹری وغیرہ کی بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں سولن کا اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر اور پٹیالے کا ناردن ریجنل لینگوئج سنٹر، مرکزی حکومت کے اردو سکھانے کے دو ایسے ادارے ہیں جہاں لینگوئج لیباریٹری Language Laboratory کی سہولیات حاصل ہیں۔ جہاں بیک وقت ۲۰ طلبہ ہیڈ فون لگا کر ٹیپ یا ڈسک ریکارڈنگ کے ذریعے اہلِ زبان کی گفتگو، تقاریر، بات چیت، مکالمہ اور مناظمہ سُن سکتے ہیں۔ اردو کے معیاری تلفظ اور لب و لہجے کی نقل اور مشق کر سکتے ہیں۔ اور اُردو سننے اور بولنے کی مکمل طور پر مشق اور مہارت بہم پہنچا سکتے ہیں۔

اردو زبان کی تدریس کا دوسرا اصول یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کو اردو بول چال اور گفتگو کے چھوٹے چھوٹے فقرے اور بنیادی جملے پوری صحتِ تلفظ کے ساتھ زبانی یاد کرا دیے جائیں۔ تدریس زبان میں گفتگو کی اہمیت اس لیے ہے کہ طلبہ اس سے نہ صرف جملوں میں الفاظ کا موزوں استعمال سیکھتے ہیں، بلکہ الفاظ کے سیاق و سباق اور ان کے برمحل استعمال سے بھی انھیں واقفیت ہو جاتی ہے۔ تدریس زبان میں مکالماتی گفتگو کو شاعری یا پُرتکلف نثر پر فوقیت دی جانی چاہیے کیونکہ گفتگو اور عام بول چال میں زبان کی بنیادی ساختوں اور نمونوں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور وہ اصل یا موجودہ سیاق و سباق کے مطابق ہوتے ہیں، جب کہ شاعری میں زبان کی ساخت کے ایسے نمونے شامل ہوتے ہیں جو نادر، انوکھے اور نامانوس ہوتے ہیں۔ اسی طرح نثری نمونوں میں سوال و جواب، عرض و التماس اور امر و نہی کے نمونے مکالماتی گفتگو کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبانوں کے نثری نمونوں میں بیانیہ جملے بہ اعتبارِ ساخت قدرے طویل ہوتے ہیں۔

غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کا تیسرا اصول یہ ہونا چاہیے کہ اردو کے لسانی

سانچوں اور نمونوں یعنی Patterns کو پیٹرن پریکٹس Pattern Practice کے ذریعے عادات کا جزو بنا دینا چاہیے، کیونکہ تحصیلِ زبان دراصل لسانی عادات کی تشکیل کا ہی دوسرا نام ہے۔ چنانچہ یہ عادات کسی شخص میں جتنی زیادہ راسخ ہوں گی، زبان کو اس شخص پر اتنی ہی زیادہ قدرت حاصل ہوگی۔ چند الفاظ، کچھ جملوں یا محض قواعد کا جان لینا زبان کا جاننا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح زبان کے بارے میں جاننا اور بات ہے اور زبان کا جاننا اور بات۔ ایک شخص کسی زبان کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اس زبان کو جان سکتا ہے۔ اس کے برعکس یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کسی زبان کے بارے میں تو سب کچھ جانتا ہو، لیکن وہ اس زبان سے نابلد ہو۔ ایک شخص جو زبان سیکھنا چاہتا ہے اُسے زبان کے بارے میں جاننے سے زیادہ زبان کا استعمال جاننا ضروری ہے۔ لیکن یہ چیز اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب پیٹرن پریکٹس کے ذریعے زبان کو عادات کا جزو بنا لیا جائے زبان کے جاننے سے مراد زبان کے فقروں، جملوں اور اس کے لسانی نمونوں کا سمجھنا اور ان کا برمحل استعمال ہے۔ پیٹرن پریکٹس کے ذریعے ان کی ادائگی اور استعمال پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

اردو زبان کی تدریس میں اردو کے صوتی نظام کی تدریس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ تدریس زبان کے چوتھے اصول کے تحت اردو زبان کے صوتی نظام کی تدریس ساختی اعتبار سے ہونی چاہیے، یعنی اردو آوازوں کی انفرادی تدریس کے بجائے انھیں چھوٹے چھوٹے الفاظ میں بروکر پیش کرنا چاہیے۔ اور مختلف آوازوں بالخصوص عربی فارسی آوازوں کی صوتی مشق بار بار کرانی چاہیے۔ مثلاً /ق/ کی آواز کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے جن میں یہ آواز لفظ کی ابتدائی درمیانی اور آخری حالتوں میں واقع ہوئی ہو مثلاً:

قَدَم	نُقل	شوق	یا
قَسَم	وَقت	حق ،	وغیرہ

تخالفی جوڑوں میں الفاظ کے اَقلی جوڑے لینے چاہئیں یعنی ایسے جوڑے جن میں صرف ایک آواز کا فرق پایا جاتا ہو، باقی تلفظ یکساں ہو۔ مثلاً کم، قم، کاش: قاش، راج: راز، اَجل: ازل، کُل: غُل وغیرہ۔ ان الفاظ میں معنی کے فرق کو تلفظ کے فرق سے واضح کرنا چاہیے۔

تحصیل زبان کے عمل کے دوران زبان کے معیاری تلفظ کو بار بار سنتے رہنا بہت ضروری ہے،

لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری الفاظ کے تلفظ کو خود ادا کرنا ہے۔ اردو آوازوں بالخصوص عربی، فارسی آوازوں مثلاً ق، ف، غ ح ز ژ / وغیرہ پر قدرت حاصل کرنے کے لیے ان آوازوں کی صحیح صوتی ادائگی اور مشق بہت ضروری ہے۔ اگر آوازوں کی ادائگی پر زبان سیکھنے والے کو قدرت حاصل ہوجاتی ہے تو زبان میں روانی پیدا ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

تدریسِ زبانِ اردو کا پانچواں اصول یہ ہونا چاہیے کہ ابتدائی مرحلے میں ذخیرۂ الفاظ کا بوجھ طلبہ پر کم سے کم ڈالا جائے۔ اس مرحلے میں استاد کی تمام تر توجہ تلفظ کی مشق اور زبان کے صوتی نظام کی تدریس، نیز اردو کے قواعدی نمونوں کی مشق و مہارت پر مرکوز ہونی چاہیے۔ ابتدائی مرحلے ہی میں ذخیرۂ الفاظ کو بڑھانے کی طرف توجہ دینا ایک غلط اور نامناسب قدم ہوگا۔ لسانیات کے نقطۂ نظر سے یہ بات مسلّم ہے کہ الفاظ خواہ اُن کی تعداد کچھ بھی ہوجائے، زبان کی تشکیل نہیں کرسکتے بلکہ زبان کی تشکیل اس کے قواعدی ڈھانچوں اور بنیادی نمونوں، نیز صوتی ہیئتوں سے ہوتی ہے لہٰذا تدریسِ زبان کے پہلے اور ابتدائی مرحلے میں استاد کی تمام تر کوشش انھی عناصر کی تدریس پر مرکوز ہونی چاہیے۔ اس مرحلے میں طلبہ کو صرف وہی الفاظ سکھائے جانے چاہئیں جو بنیادی لسانی سانچوں اور نمونوں کی تشکیل کے لیے ضروری ہوں یا جن سے الفاظ کے تخالفی اور اقلی جوڑے بنانے میں مدد ملتی ہو۔ جب طلبہ زبان کے بنیادی سانچوں، ڈھانچوں اور نمونوں کو اچھی طرح سیکھ جائیں، اور جب انھیں زبان کے تلفظ اور اس کے صوتی نظام پر قدرت حاصل ہوجائے تب ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور انھیں خاص خاص سیاق و سباق سے تعلق رکھنے والے الفاظ و محاورات اور لفظیات سے روشناس کرانا چاہیے۔

تدریسِ زبان کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم غالباً اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ غیر مادری زبان کی تدریس میں مادری زبان بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تدریسِ زبان میں غیر مادری زبان اور مادری زبان کے تقابلی اور تخالفی مطالعے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ غیر مادری زبان کا مادری زبان سے مقابلہ کرنے پر دونوں زبانوں کے درمیان بہت سے مشترک عناصر کا پتا چل جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ بہت سے تخالفی عناصر بھی چھٹ کر سامنے آجاتے ہیں۔ دونوں زبانوں کے درمیان پائے جانے والے مشترک عناصر کی

تدریس بہت آسان ہوتی ہے اور اس کے لیے استاد کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ ان عناصر کا محض تعارف ہی زبان سیکھنے والوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ لیکن غیر مادری زبان میں جو تخالفی عناصر پائے جاتے ہیں، ان کی تدریس بیحد دشوار ہوتی ہے، اور تدریس زبان کا صحیح معنوں میں یہی سخت مقام ہوتا ہے اور استاد کے لیے یہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ان تخالفی عناصر کی تدریس میں استاد کو کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ ایک کامیاب استاد مانا جاتا ہے۔ اور اگر ان تخالفی عناصر کی تحصیل و تدریس میں کہیں بھی کوئی کمی یا خامی باقی رہ جاتی ہے تو غیر مادری زبان کی تحصیل و تدریس ناقص، نامکمل اور ادھوری سمجھی جاتی ہے، لہٰذا تدریس زبان کے چھٹے اصول کے تحت یہ ضروری ہے کہ غیر مادری زبان اور مادری زبان کے تقابلی اور تخالفی مطالعے کے ذریعے دونوں زبانوں کے مشترک اور تخالفی عناصر کا پتا لگا لیا جائے اور غیر مادری زبان کے ان تمام صوتی، صرفی، نحوی اور قواعدی عناصر کی تدریس پر پوری توجہ مرکوز کی جائے جو مادری زبان میں مفقود ہیں۔ چونکہ غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو سیکھنے والے طلبہ مختلف لسانی ماحول اور مختلف مادری زبانوں کے ہو سکتے ہیں، لہٰذا ان کے تخالفی عناصر بھی مختلف النوع ہوں گے اور اُن کی تدریس کی نوعیت بھی دوسری ہوگی۔ مثلاً اگر کوئی ہندی بولنے والا اردو سیکھتا ہے تو اس کے تدریسی مسائل اس شخص سے مختلف ہوں گے جس کی زبان بنگالی ہے اور وہ اردو سیکھنا چاہتا ہے۔ ہندی کے صوتی نظام میں /ق ف خ غ ز/ اور /ژ/ کی آوازیں شامل نہیں ہیں، جب کہ یہ آوازیں اردو صوتیات کا جزوِ لاینفک ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی اردو بولنے والا ان آوازوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا لیکن ہندی بولنے والوں کے لیے یہ آوازیں تخالفی عناصر کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان آوازوں کی تدریس پر استاد کو پوری توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برخلاف /ب پ ت/ یا /د ڈ/ یا /س ش/ اور /ک گ/ وغیرہ آوازوں یا ہکار اور کوز آوازوں کی تحصیل ہندی بولنے والوں کے لیے بہت آسان ہوتی ہے، کیونکہ یہ آوازیں مشترک عناصر کا درجہ رکھتی ہیں اور ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی صوتیات میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں، لہٰذا ان آوازوں کا محض تعارف ہی طلبہ کے لیے کافی ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہندی بولنے والوں کو اردو سکھاتے وقت اردو کے تخالفی صوتی عناصر یعنی عربی فارسی آوازوں کی مشق و مہارت بہم نہیں پہنچائی گئی تو

وہ غالب کو 'گالب'، قوم کو 'کوم'، خبر کو 'کھبر' مزا کو 'مجا' اور فوج کو 'پھوج' کہنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ان کی اردو دانی حد درجہ ناقص تصور کی جائے گی۔

اسی طرح ایک عربی بولنے والے کو اردو سکھاتے وقت اردو کی تمام معکوسی آوازوں مثلاً ٹ ڈ ڑ اور تمام ہکار آوازوں مثلاً پھ بھ تھ دھ وغیرہ، اور پ چ گ کی صوتی مشق کرانا نہایت ضروری ہے اور اگر اس نے ان آوازوں کی مشق کے بغیر اردو سیکھ لی تو اُسے پانی کو بانی گول کو غول، چال کو جال، ڈال کو دال اور بھالو کو بالو کہنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوگی۔ کیونکہ عربی زبان میں نہ تو معکوسی آوازیں پائی جاتی ہیں اور نہ ہکار آوازیں۔ پ، گ اور چ کی آوازیں بھی عربی کے صوتی نظام میں مفقود ہیں۔

تدریسِ زبان کا ساتواں اصول یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ کو جو لسانی سانچے یا نمونے اور جملے سکھائے جائیں وہ بتدریج سکھائے جائیں۔ چونکہ زبان کی تحصیل، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ایک قسم کی عادت کی تشکیل ہے اور کسی چیز کی عادت بتدریج ہی ڈالی جا سکتی ہے، لہٰذا زبان کی تدریس بھی آہستہ آہستہ اور بتدریج ہونی چاہیے۔ اسی طرح جو چیز پہلے سکھائی جا چکی ہے اس کا بعد میں سکھائی جانے والی چیزوں سے رشتہ برقرار رہنا چاہیے اور ایک لسانی سانچہ دوسرے لسانی سانچے سے باہم مربوط ہونا چاہیے۔ ابتدا میں زبان کے بنیادی عناصر مثلاً اجزائے کلام یا وضعی الفاظ کی مدد سے چھوٹے چھوٹے جملوی نمونے ترتیب دیے جا سکتے ہیں پھر تدریسِ زبان کے اگلے مرحلے میں ان کی توسیع کی جا سکتی ہے۔

تدریسِ زبان کے ان تمام اصولوں کو برتتے وقت استاد کو مشق کی جانب سے کسی بھی لمحہ غافل نہیں ہونا چاہیے اور طلبہ کو زیادہ سے زیادہ مشقی کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مشق میں چیزوں کے بار بار دہرانے، انھیں زبانی یاد کرنے اور ان کی نقل یا تقلید کرنے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ زبان کے صوتی، صرفی، نحوی اور قواعدی نمونوں کی طلبہ کو جتنی زیادہ مشق کرائی جائے گی اتنی ہی زیادہ اچھی طرح وہ زبان کو سیکھ سکیں گے۔ چارلز فریز نے کلاس کے مجموعی اوقات کا ۸۵ فی صد حصہ مشق کے لیے اور صرف ۱۵ فی صد حصہ تشریح و توضیح کے لیے وقف کرنے کی سفارش کی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تدریس زبان میں مشق کو کتنی زیادہ

اہمیت حاصل ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے غیر مادری زبان کی تحصیل چار لسانی مہارتوں یعنی سننے، بولنے پڑھنے اور لکھنے کی تحصیل پر مشتمل ہے۔ اور انہی لسانی مہارتوں کی تدریس غیر مادری زبان کی تدریس کا جو بھی نصاب ترتیب دیا جائے گا اس میں ان تمام لسانی مہارتوں کی شمولیت لازمی ہوگی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اردو زبان کی تحصیل کی پہلی سطح اردو کے صوتی نظام کی مشق ہے۔ لہٰذا اردو بہ طور غیر مادری زبان کا نصاب اس طور سے ترتیب دیا جانا چاہیے کہ طلبہ کو سب سے پہلے اردو زبان کے صوتی نظام اور تلفظ پر پوری قدرت حاصل ہو جائے۔ اردو آوازوں کی ادائگی اور اُن کے تلفظ پر قدرت حاصل ہو جانے سے طلبہ کو اردو بولنے کی مہارت حاصل کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ قدیم طرزِ تدریس کے مطابق اردو زبان کی تدریس مفرد حروف کی شناخت سے شروع کی جاتی ہے، اور تدریسِ زبان کے ابتدائی مرحلے ہی سے لکھنے پڑھنے پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پھر طلبہ کا رُخ ادب کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ تدریسِ زبان کا یہ طریقہ ناقص ہی نہیں بلکہ غیر فطری بھی ہے۔ جب تک کہ طلبہ کو زبان کے سننے (سمجھنے) اور بولنے پر قدرت حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک انھیں لکھنا پڑھنا نہیں سکھانا چاہیے ادب کی تدریس بھی اس وقت تک کے لیے موقوف کر دینی چاہیے، کیونکہ اگر زبان کی تحصیل و تدریس نامکمل اور تشنہ رہی تو ادب کی افہام و تفہیم اور تحسین شناسی بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکے گی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے زبان کی تحصیل و تدریس کے مرحلے میں ادب کی تدریس کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ زبان کی تحصیل و تدریس مکمل ہو جانے پر ہی طلبہ کو حسبِ ضرورت اُس زبان کے ادب سے روشناس کرانا چاہیے۔

اردو کا صوتیاتی نظام اردو کی مُصمتی اور مُصوتی آوازوں پر مشتمل ہے جن میں عربی فارسی کی آوازیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ مشدّد آوازیں، مُصمتی خوشے، مُصوتوں کی انفیت اور مُصمتوں کی ہکاریت اور معکوسیت، نیز آوازوں کی ادائگی اور لب و لہجے کو بھی نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اردو بہ طور غیر مادری زبان کے نصاب میں ان تمام باتوں کی تدریس لازمی ہے۔ لیکن طلبہ کے لیے ان تمام باتوں کا علم اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ان کا صحیح تلفظ اور استعمال ضروری ہے۔ مثلاً طلبہ کے لیے یہ جاننا چنداں ضروری نہیں کہ /خ/ کی آواز مُصمتہ ہے یا مُصوتہ، یا

طرزِ ادائگی یا مخرج کے لحاظ سے اس آواز کا کیا نام ہے، لیکن طلبہ کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ اس کا تلفظ کس طرح کیا جاتا ہے تاکہ اردو بولتے وقت اس آواز کے استعمال کی ضرورت پڑنے پر وہ صحیح تلفظ کے ساتھ اسے ادا کرسکیں۔ اردو کے صوتی نظام اور تلفظ کی تدریس کا ذکر تدریسِ زبان کے اصولوں کے ضمن میں آچکا ہے۔ یہاں صرف اس امر کا اعادہ ضروری ہے کہ اردو آوازوں اور تلفظ کی مشق اور نقل الفاظ کے سیاق و سباق میں کرائی جانی چاہیے۔ شروع میں صرف وہی چند ضروری اور بنیادی الفاظ استعمال کیے جانے چاہئیں جن کی صوتی مشق اور پیٹرن پریکٹس کے لیے صحیح معنوں میں ضرورت ہو۔ اس کے بعد بتدریج الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔ پھر چھوٹے چھوٹے بنیادی فقروں اور جملوں کی مشق پر توجہ دینی چاہیے۔ اگر غیر مادری زبان کی آوازوں، لفظوں، فقروں اور بنیادی جملوں کی مشق برابر جاری رہی تو کچھ ہی دنوں میں طلبہ کو اُس زبان کا کسی حد تک بولنا اور سمجھنا آجائے گا، پھر انھیں اردو پڑھنے اور لکھنے کی بھی مشق کرائی جاسکتی ہے جو تدریسِ زبان کے نصاب کا دوسرا حصہ ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ زبان کی تدریس کو رسمِ خط کی تدریس کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ زبان کی تدریس زبان کے سننے (سمجھنے) اور بولنے کی تدریس سے عبارت ہے، جبکہ رسمِ خط کی تدریس پہلے سے سیکھی ہوئی زبان کی صوری نمائندگی کرنے والی علامات کی شناخت کی تدریس ہے۔ اسی لیے رسمِ خط یا پڑھنے اور لکھنے کی تدریس کو تدریس زبان کے نصاب کے دوسرے حصے میں شامل کرنا چاہیے۔

اردو کا تحریری نظام ابجدی نظام یعنی Alphabetic کہلاتا ہے، کیونکہ اس کی تحریری علامات مُصمتوں اور مُصوتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان تحریری علامات کو حروف بھی کہتے ہیں۔ اردو پڑھنے کا تعلق تحریری علامات یعنی حروف اور ان کی بدلی ہوئی یا ترکیبی شکلوں، نیز حروف کے جوڑوں کی شناخت سے ہے۔ اُردو کے بیشتر حروف جب دوسرے حروف کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں تو ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں، تاہم اردو کے نو حروف یعنی ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ اور و ایسے حروف ہیں جو اپنے بعد میں آنے والے حروف کے ساتھ جوڑے نہیں جاسکتے۔ اردو کے بیشتر حروف ایسے ہیں جو لفظ کی ابتدائی اور درمیانی حالتوں میں تو اپنی شکلیں بالکل

بدل دیتے ہیں لیکن لفظ کی آخری حالت میں ان کی شکلیں غیر مُتبدّل رہتی ہیں۔ اردو رسم خط کی تدریس کا مشکل ترین مرحلہ اردو کی بدلی ہوئی یا ترکیبی شکلوں کی تدریس ہے۔ اردو حروفِ تہجی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھیں صوری اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے مثلاً ب پ ت ٹ ث یا ج چ ح خ یا د ڈ ذ یا س ش وغیرہ۔ جبکہ دیوناگری کے حروف صوتی لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ اردو حروف تہجی کی یہ صوری ترتیب اردو رسم خط کی تدریس میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اردو حروفِ تہجی کے کسی بھی صوری گروپ کا محض ایک حرف سیکھ لینے سے اُس گروپ کے دوسرے حروف کا سیکھنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ دیوناگری حروف میں یہ بات نہیں کہ اس کا ہر حرف علاحدہ شکل وصورت رکھتا ہے اور ہر حرف کو نئے سرے سے سیکھنا پڑتا ہے۔ صوری ترتیب کے لحاظ سے اردو کے ۳۶ حروف کو ذیل کے ۱۴ گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) ا

(۲) ب پ ت ٹ ث ف

(۳) ج چ ح خ

(۴) د ڈ ذ

(۵) ر ڑ ز ژ و

(۶) س ش

(۷) ص ض

(۸) ط ظ

(۹) ع غ

(۱۰) ک گ

(۱۱) ل ن ی ق

(۱۲) م

(۱۳) ہ

(۱۴) ے

ان چودہ گروپوں کی مشق سے اردو کے ۳۶ حروف کی شناخت پر بہ خوبی قدرت حاصل کی جاسکتی ہے۔

اردو رسم خط کی تدریس کے ابتدائی مرحلے میں ایسے حروف کی شناخت اور تحریری مشق کرائی جانی چاہیے جو Non-connectors ہیں یعنی جو ما بعد کے حروف کے ساتھ جوڑے نہیں جاسکتے۔ مثلاً د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و وغیرہ لیکن ان میں سے کوئی بھی حرف انفرادی طور پر نہیں سکھایا جانا چاہیے بلکہ ان کی تدریس الفاظ کے سیاق و سباق میں ہونی چاہیے۔ رسم خط کی تدریس کے نقطۂ نظر سے شروع میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے جن میں تمام حروف الگ الگ لکھے جاتے ہوں مثلاً دادا، دارا، دال، ڈال، آم، آپ، رات، راہ، راز، دام، وغیرہ۔ پھر ان الفاظ کی مدد سے چھوٹے چھوٹے جملے ترتیب دینے چاہئیں مثلاً دادا آ، دو آم دے، دام دے وغیرہ۔ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ایک صوری گروپ کے تمام حروف بہ یک وقت یکے بعد دیگرے سکھا دیے جائیں یعنی اگر ب سکھائی جائے تو پ ت ٹ ث بھی سکھا دی جائے اور س سکھائی جائے تو ش بھی سکھا دی جائے اور ک سکھایا جائے تو گ بھی سکھا دیا جائے۔ ایسے گروپ کے حروف پہلے سکھائے جائیں جن کی تشکیل آسان ہو۔ تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ کھڑی اور پڑی لکیروں کی مدد سے بننے والے حروف کی تدریس دوسرے حروف کی تدریس کی بہ نسبت آسان ہوتی ہے، مثلاً ا م یا ب پ ٹ ث اور ف کا بنانا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا ان حروف سے طلبہ کو پہلے روشناس کرانا چاہیے۔ اس کے بعد دائروں یا نیم دائروں کی مدد سے بننے والے حروف کی تدریس کی جانب توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ایسے حروف یہ ہیں، مثلاً ج چ ح خ ع غ ن ی ق س ش ص ض اور د ڈ ذ وغیرہ اس کے بعد ایسے حروف لیے جائیں جو کھڑی اور پڑی لکیر کے امتزاج سے بنتے ہیں مثلاً ک گ وغیرہ یا جو کھڑی لکیر اور نیم دائرے کی مدد سے بنتے ہیں۔ مثلاً ل۔ پھر ایسے حروف لینے چاہئیں جو ہیئتی اعتبار سے قدرے پیچیدہ ہیں مثلاً ط ظ وغیرہ۔ اساتذہ کو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ اردو کے تمام حروف الفاظ کے سیاق و سباق میں سکھائے جائیں اور الفاظ جملوں کے سیاق و سباق میں سکھائے جائیں۔ حتی الامکان اردو کا کوئی بھی حرف سیاق و سباق سے ہٹ کر نہ سکھایا جائے اور جب تک کہ حروف کی مفرد شکلیں نہ

سکھا دی جائیں، ان حروف کی بدلی ہوئی شکلوں سے طلبہ کو متعارف نہ کرایا جائے، مثلاً اب یا رب کے ذریعے ب کی مفرد شکل سکھانے کے بعد ہی بات کا لفظ سکھایا جائے جس میں ب کی بدلی ہوئی شکل استعمال ہوئی ہے۔ پرانے طریقۂ تدریس کے مطابق پہلے تمام حروف تہجی کو رٹا دیا جاتا ہے اور سیاق و سباق سے بالکل ہٹ کر فرداً فرداً اُن کے لکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ پھر ان حروف کی بدلی ہوئی شکلیں بغیر کسی سیاق و سباق کے سکھائی جاتی ہیں۔ مثلاً با بب بج بد۔ ربس ربط وغیرہ۔ ان میں حروف کی بدلی ہوئی یا ترکیبی شکلوں کے بہت سے مہمل جوڑ یعنی Combination بھی بچے کو سیکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد سہ حرفی چہار حرفی اور پنج حرفی الفاظ سکھائے جاتے ہیں تب کہیں جا کر جملے بنانے کی باری آتی ہے۔ اردو رسمِ خط کا یہ طریقۂ تدریس صد درجہ ناقص ہے۔ جدید طریقۂ تعلیم و تدریس کے مطابق زبان یا رسمِ خط کے کسی بھی یونٹ کو سیاق و سباق یعنی Contex سے الگ کر کے نہیں سکھانا چاہیے۔ اسی طرح مہمل لفظ یا حصۂ لفظ کی تدریس کا جواز بھی کسی بھی طرح پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

اردو رسمِ خط کی تدریس میں اعراب و علامات کی تدریس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو رسمِ خط کی تدریس کے ابتدائی چند اسباق کے دوران ہی طلبہ کو زیر، زبر، پیش، ء، تشدید نونِ غنّہ اور جزم سے روشناس کرا دینا چاہیے۔ یہ تمام اعراب و علامات حروف کی مفرد اور ترکیبی شکلوں سے بننے والے الفاظ کے ساتھ سکھا دینے چاہئیں۔ بعد کے اسباق میں ہائے مخلوط واوِ معدولہ، تنوین، الفِ وصل، اضافت، واوِ عطف اور الفِ مقصورہ کا استعمال سکھانا چاہیے۔

اردو رسمِ خط کی تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو انشا اور کمپوزیشن کی مشق بھی کرانی چاہیے کیونکہ طلبہ نے زبان سیکھنے کے بعد زبان کو رسمِ خط میں ڈھالنا بھی سیکھ لیا ہے یا سیکھ رہے ہیں، لہٰذا وہ اپنے خیال کو تحریر کا جامہ پہنا سکتے ہیں۔ طلبہ کے سامنے اب یہ مسئلہ نہیں رہ جاتا کہ کیسے کہا جائے بلکہ یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیا کہا جائے۔ چنانچہ تدریس زبان کے اس مرحلے تک پہنچنے پر طلبہ کو چھوٹے چھوٹے عام فہم موضوعات پر مضامین لکھنے کی مشق کرانی چاہیے۔ خطوط نویسی کی ابتدا بھی اسی منزل سے ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں طلبہ کی تحریریں گنجلک پن کا شکار ہوں لیکن

متواتر مشق کے ذریعے ان تحریروں میں صفائی، تاثر اور تنظیم پیدا ہو سکتی ہے۔

غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس میں سننے اور بولنے، نیز پڑھنے اور لکھنے کی تدریس کو اوّلیت حاصل ہے۔ سننے اور بولنے کی تدریس اردو بطور غیر مادری زبان کے نصاب کا جزوِ اوّل ہے۔ نصاب کا دوسرا حصّہ پڑھنے اور لکھنے کی تدریس پر مشتمل ہے۔ نصاب کے تیسرے حصّے میں اردو زبان کے ایسے نمونے اور اسباق شامل ہونے چاہئیں جو طلبہ کی عمر، مزاج، دلچسپی اور نفسیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ترتیب دیے گئے ہوں۔ مثلاً پرائمری منزل کے لیے ان موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے جیسے چڑیاں اور جانور اور اُن سے متعلق کہانیاں پریوں کی کہانیاں قدرتی مناظر اور مظاہر مثلاً بارش، چاند، تارے، رات دن وغیرہ جاڑا گرمی وغیرہ، اساطیری کہانیاں، میلے اور تہوار، سیر و تفریح، گھر، اسکول اور پڑوس، کھیل کود، لطائف، رنگ برنگی چیزیں، کھلونے، کھانے پینے کی چیزیں، سیر سپاٹا، نمائش، بچوں کی کہانیاں، مکالمے، سفر کے حالات، عظیم شخصیات کے بچپن کے واقعات، لوک کہانیاں، اور بیانیہ نظمیں وغیرہ۔

اسی طرح مڈل کی منزل کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے وہ یہ ہیں مثلاً عظیم شخصیات مہم اور بہادری، سفر، دوسرے ملکوں کے لوگوں کے حالات، ذرائع آمد و رفت، ڈرامے، سماجی کہانیاں علاقائی دلچسپی کی باتیں، کھیل کود، سیر و تفریح اور شکار، حب الوطنی کے موضوعات، حیوانی زندگی، جنگ کی کہانیاں نظمیں وغیرہ۔ ثانوی سطح پر ان موضوعات کا انتخاب کیا جاسکتا ہے: مثلاً دنیا کی باتیں، ایجادات و دریافت، تاریخی کہانیاں، جنگلی جانور، سائنس، قومی اور ملکی مسائل، کھیل کود، طنز و مزاح، مہم اور بہادری، پراسراریت، جاسوسی کہانیاں، مذہب اور عقائد، سوانح عمری، فن اور موسیقی، حب الوطنی کے موضوعات، تہذیب، سیاست، مختصر کہانیاں وغیرہ۔

پرائمری، مڈل اور ثانوی منزل کے نصابات کے لیے جو تدریسی مواد ترتیب دیے جائیں ان کی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ ان میں کچھ اقدار یعنی Values کی تعلیم بھی پوشیدہ ہو مثلاً باہمی تعاون ایمانداری، صفائی، پابندیِ وقت، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت، سچائی، ہمت و جواں مردی، محنت کی عزت، عزم، مساوات، وفاداری، فرماں برداری، عفو و درگذر، انکساری، رحم دلی، حُب الوطنی، خود اعتمادی، عزتِ نفس، اتحاد، جمالیاتی احساس، عدل و انصاف،

شرافت، سیکولرزم اور قومی یک جہتی وغیرہ۔

اردو بطور غیر مادری زبان کے نصاب کا چوتھا حصہ ادب کی تدریس پر مشتمل ہونا چاہیے لیکن ادب کی تدریس اس وقت تک کے لیے موقوف رکھنی چاہیے جب تک کہ طلبہ کو زبان پر پوری قدرت حاصل نہ ہو جائے۔ ادب کی تدریس کے لیے ثانوی منزل اور اعلا ثانوی منزل یعنی ۲+ زیادہ موزوں ہے۔ ادب کی تدریس کے ذریعے طلبہ میں جمالیاتی قدروں کا احساس پیدا کرنا اور ان کی ادبی تحسین شناسی کی صلاحیت کو بیدار کرنا ہے۔ غیر مادری زبان کے ادب کی تدریس کے ذریعے طلبہ ایک نئی تہذیب سے واقفیت حاصل کرتے ہیں، لہٰذا غیر مادری زبان کے ادب کی تدریس کے جمالیاتی مقصد کے ساتھ ساتھ تہذیبی مقصد کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے اور نصاب میں ایسے ادب پارے شامل کرنے چاہئیں جن سے اس زبان کی تہذیب کی بھرپور عکاسی ہوتی ہو تبھی وہ نصاب صحیح معنوں میں مکمل نصاب کہا جا سکے گا۔